گوہرِ پس انداز
وسیم حیدر ہاشمی

حادثہ وہ، جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اُس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

علامہ اقبال

گوہرِ پس انداز

(افسانوی مجموعہ)

وسیم حیدر ہاشمی

GAUHARE PAS-ANDAAZ

SHORT STORIES BY

WASEEM HAIDAR HASHIMI

MG 1/4, KABEER COLONY,
BANARAS HINDU UNIVERSITY CAMPUS,
VARANASI-221005.
CELL: 9451067040

978-93-5235-492-4 : ISBN

- نام کتاب : گوہرِ پس انداز
- مصنف : وسیم حیدر ہاشمی
- تعداد : ۴۰۰
- سن اشاعت : ۲۰۱۵ء [بارِ اول]
- قیمت : ۴۵۰ روپے
- ناشر : مصنف
- کمپوزنگ : شہنشاہ حسین
- تزئین وصفحہ آرائی : ع۔ الہدیٰ
- طباعتی اہتمام : پرنٹیا، PRINTIA میداگن، وارانسی 9125797969

دستیابی کے پتے

(۱) B.16/43 شوالہ، وارانسی۔۲۲۱۰۰۱

(۲) مرکز تحقیقات اردو و فارسی، گوپالپور، سیوان [بہار]

The Author

انتساب

اپنی شریکِ حیات

کہکشاں بانو

کے نام

جو میرے پڑھائی لکھائی کے کاموں میں ہمیشہ معاون رہیں۔
اگر ان کاموں میں
ان کی معاونت شامل نہ ہوتی تو میں اردو ادب کی اتنی خدمت ہرگز نہ کر پاتا۔

وسیم حیدر ہاشمی

فہرست مضامین

پیش لفظ

'گوہرِ پس انداز' میرا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس سے قبل میرے دو افسانوی مجموعے 'کرچیاں' ۲۰۰۷ء اور 'مریخ کا سفر' ۲۰۱۰ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ۲۰۱۰ء سے ۲۰۱۴ء کے درمیان میرے متعدد افسانے رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں مگر اس درمیان چونکہ کوئی افسانوی مجموعہ منظرِ عام پر نہیں آسکا تھا اس لیے اکثر قارئین حضرات میری نئی کتاب کے لیے مجھ سے تقاضہ کیا کرتے تھے۔ معزز قارئین کی خواہشوں کا احترام کرتے ہوے راقم نے زیرِ نظر افسانوی مجموعہ مرتب کے شائع کروادیا۔

میرے دیگر افسانوی مجموعوں کے مانند اس مجموعے کے افسانے بھی کسی تحریک، نظریات یا تصورات پر مبنی نہیں ہیں بلکہ معاشرے کی اصل صورت پر خلق کیے گیے ہیں۔ مجھے میرے اردگرد سماجی اور معاشرتی زندگیوں میں جو کچھ بھی غلط، انسانی قدروں کے خلاف، سماج کے لیے نقصان دہ نظر آیا، میں نے اس کے خلاف قلم اٹھایا اور انھیں افسانوں کی شکل میں ڈھال کر صفحۂ قرطاس کے حوالے کر دیا۔ افسانوں کے تعلق سے میری ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ میری تمام تخلیق معاشرے کی اصل صورت کی وضاحت ہوں۔ میں اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب یا ناکام رہا ہوں، اس کا حتمی فیصلہ میں باذوق، منصف اور بے باک قارئین پر چھوڑتا ہوں۔ ہمارے معزز قارئین کی پیش قیمتی آرا ہی ہمارے لیے ہمیشہ مشعلِ راہ ثابت ہوئی ہے چنانچہ راقم السطور کو قوی امید ہے کہ اس مرتبہ بھی معزز قارئین اپنی پیش قیمتی آرا اور سخت ترین تنقید سے راقم الحروف کو گوش گزار ضرور فرمائیں گے جو میرے نزدیک بہر صورت قابلِ قبول ہوگی۔

مخلص

وسیم حیدر ہاشمی

MG 1/4, Kabeer Colony,
Banaras Hindu University Campus,
Varanasi-221005.
Cell: 9451067040, 9580698805
e-mail: whh55bhu@gmail.com

وسیم حیدر ہاشمی کی افسانہ نگاری: ایک تاثر

افسانوی مجموعہ 'کرچیاں' کی روشنی میں

• ڈاکٹر ناظم جعفری، دالمنڈی، وارانسی

وسیم حیدر ہاشمی کو غیر معروف نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۹۳ء میں اس وقت ہوا جب ہندی ناول 'جھینی جھینی بینی چدریا' کا ان کا اردو ترجمہ منظر عام پر آیا۔ ہندی سے اردو میں یہ ایک اعلیٰ ترجمے کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کے علاوہ ان کی کہانیاں وقتاً فوقتاً رسالوں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ طویل انتظار کے بعد ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ 'کرچیاں' کے عنوان سے منظر عام پر آرہا ہے۔

طویل یا مختصر، افسانہ کوئی بھی ہو، اس کا حسن اس کے انداز بیان پر اور اس سے زیادہ انجام پر چونکا دینے والی کیفیت پر منحصر ہے۔ وسیم حیدر ہاشمی کا انداز بیان بہت شائستہ اور لب ولہجہ متاثر کرنے والا ہے۔ ان کی کہانیوں میں 'چپراسی کی گواہی یا سڑانڈ' پڑھنے کے بعد قاری کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ المیہ آج کے دور کا صدفی صد حصہ ہے۔ 'فتح نامہ' مختلف فکر رکھنے والے انسان کے لیے دعوت فکر ہے۔ وسیم حیدر کے افسانوں میں چونکا دینے والی کیفیت بدرجہ اتم موجود ہے۔

''اللہ کرے زور قلم اور زیادہ''

مجھے یقین ہے کہ ان کی کہانیاں مقبول ہوں گی اور رفتہ رفتہ وہ اپنا مقام افسانہ نگاری میں حاصل کرلیں گے۔

۱۱/اگست، ۲۰۰۷ء

وسیم حیدر ہاشمی کا اولین افسانوی مجموعہ

کرچیاں

• پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، حیدرآباد

(روزنامہ 'سیاست' ادبی اور ثقافتی ایڈیشن، حیدرآباد۔ ۲۸ ر جون ۲۰۰۸ء)

یوں کہنے کو صنف افسانہ نے بہت سے موڑ لیے ہیں لیکن افسانے میں اگر افسانہ پن، قصہ نہیں تو وہ کچھ اور ہے، افسانہ نہیں۔ ان دنوں افسانے میں کیسے کیسے تجربات نہیں کیے جارہے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ بھی ہیں جو روایتی انداز کے افسانے لکھتے ہیں اور بہت اچھے افسانے۔ ان میں قصہ پن بھی ہوتا ہے اور قاری کے لیے دلچسپی کا سامان بھی۔ ایسے افسانہ نگاروں نے مقصدیت کو بھی ملحوظ رکھا اور زبان و بیان کے تقاضوں کو بھی پورا کیا۔ طرز ادا اور اسلوب پر بھی توجہ دی۔ وسیم حیدر ہاشمی بھی کچھ ایسے ہی افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں کا مجموعہ 'کرچیاں' زیر مطالعہ ہے۔ ہاشمی ایک مدت سے افسانہ لکھ رہے ہیں۔ لیکن اِدھر چند برسوں سے انھوں نے افسانہ نگاری پر خصوصی توجہ دی ہے۔ اپنی کہانیوں کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے اور بجا طور پر لکھا ہے ''یہ کہانیاں کسی تحریک، نظریات یا تصورات پر مبنی ہونے کے بجائے معاشرے کی اصل صورت پر خلق کی گئی ہیں۔ ان میں لسانی جبلت اور ہمارے گرد و پیش کی زندگی سانس لے رہی ہے۔ ان میں سیاسی، سماجی اور انسانی بے حسی، عیاری اور مکاری بھی ہے اور لہولہان کردینے والی کرچیاں بھی۔'' واقعہ بھی یہی ہے کہ انھوں نے کہانیاں نہیں لکھی ہیں، ہمارے آس پاس کی زندگی کی آئینہ داری کردی ہے۔ 'سڑاند، نندی کا مول، جس کی لاٹھی، فتح نامہ، ڈنک، اور خودداری' میں معاشرے کے کئی رُخ سامنے آتے ہیں۔ 'چپراسی کی گواہی، راجہ کا انصاف اور دل دریا' میں قاری کی دلچسپی کو ملحوظ رکھا گیا ہے، 'تعبیر' کا موضوع ضعیف الاعتقادی ہے تو 'سفارش' ہماری یونیورسٹیوں کا حال زار۔ 'ہار کی جیت' ہلکا پھلکا رومانی افسانہ ہے تو 'دل دریا' میں بعض کی نفسیات سامنے آتی ہے۔ 'رام کے نام' بابری مسجد کے انہدام کے پس منظر میں تحریر کیا گیا ہے۔ 'کرچیاں' مجموعی طور پر افسانوں کا اچھا سا مجموعہ ہے۔ وسیم حیدر ہاشمی کو زبان و بیان پر قدرت ہے۔ ان کا طرز تحریر شگفتہ ہے۔ ۱۷۶ ر صفحات پر مشتمل افسانوں کے اس مجموعے کی قیمت ۱۲۵ ر روپے ہے۔ وسیم حیدر ہاشمی، B.10/43 شوالا، وارانسی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

کہانی بیان کرنے والا ایک منفرد فنکار

وسیم حیدر ہاشمی

• مجیر احمد آزاد

خان صاحب کی ڈیوڑھی، دربھنگا۔ ۸۴۶۰۰۴۱ (بہار)

اردو افسانہ ترقی کے زینے طے کرتا ہوا بلندی کی جانب گامزن ہے۔ ابتداء سے اب تک اس کی مقبولیت کے اسباب میں قصہ پن کو مرکزیت حاصل رہی ہے۔ یہ قصہ ہی ہے کہ خواص وعوام کی دلچسپی میں قائم ودائم ہے۔ جب ماورائی فکر وخیال اور قصہ کی عدم شمولیت سے افسانہ اپنے حلقہ قاری سے دور ہوا تو کہانی پن کی واپسی سے ہی روٹھے دلوں میں محبت والفت کے دریا رواں ہوئے۔ آج بھی وہی افسانے زیادہ پسند کیے جاتے ہیں جس کی بنت میں قصہ گوئی کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ نئی نسل کے افسانہ نگاروں میں وسیم حیدر ہاشمی کے یہاں مذکورہ خوبی بہ درجہ اتم موجود ہے۔ جس کے سہارے ان کا حلقۂ قاری وسیع تر ہے۔

'کرچیاں'، 'مریخ کا سفر' اور 'گوہر پس انداز' (افسانوی مجموعے) سمیت ان کے دوسرے افسانے آج کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ جس کی بنت میں گرتی ہوئی انسانی قدریں، شکنجہ کستے ہوئے چھوٹے چھوٹے مسائل، روزمرہ کے نامساعد حالات، زندگی کی دشواریاں دامن گیر ہیں۔ موضوع کو خوبصورتی سے برتتے ہوئے حیدر ہاشمی قاری کو چونکاتے ہیں اور سوچنے کو مجبور کرتے ہیں۔

مریخ کا سفر (افسانوی مجموعہ)

ایک تاثر

• پروفیسر سید حسن عباس
شعبۂ فارسی بنارس ہندو یونیورسٹی

وسیم حیدر ہاشمی ایک حساس دل کے مالک قلم کار بلکہ فن کار ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش کے حالات و واقعات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان سے خود بھی متاثر ہوتے ہیں اور انھیں افسانوی قالب میں پیش کر کے اپنے قارئین کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے سچے احساسات و جذبات کی عکاسی بڑی فنکاری سے کی ہے۔ چھوٹے بڑے موضوعات پر جس طرح قلم اٹھایا ہے، اس سے ان کی حسی بیداری کا پتا چلتا ہے۔ وہ بڑے زود نویس بھی ہیں۔ کوئی نیا موضوع ذہن میں آیا اور انھوں نے کوئی نیا افسانہ لکھ ڈالا۔ وہ جیسا سوچتے ہیں اسے اسی طرح صفحۂ قرطاس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں زبان کا جیسا پختہ، شستہ اور لطیف استعمال ہونا چاہیے، اس کا فقدان اگر نہ کہیں تو کمی کا احساس تو ہوتا ہی ہے۔ لیکن ان کے سچے جذبات اور حقیقت نگاری کے عمل کی قدر ضرور کی جانی چاہیے۔ ان کے افسانوں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ انھوں نے تاریخ اسلام کے بعض اہم گوشوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ایسے افسانوں میں 'فتح نامہ، جہاں دار' اور صادق الاقرار' قابل ذکر ہیں۔ وسیم حیدر ہاشمی ادب برائے زندگی کے قائل ہیں اور ان کے افسانوں میں انسانی زندگی کے اچھے اور برے پہلوؤں کو بخوبی اجاگر کیا گیا ہے۔ ملک و معاشرے کے ایک سچے ہمدرد کی طرح ان کا دل سماجی برائیوں کو دیکھ کر کڑھتا ہے اور اچھائیوں پر خوشی سے جھوم اٹھتا ہے۔ چونکہ اچھائیوں کے مقابلے برائیاں زیادہ ہوتی ہیں اس لیے وہ ان برائیوں سے لوگوں کو ہوشیار رکھنے کے لیے انھیں موضوع بناتے ہیں اور اچھائیاں اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ انسانیت کا یہی پیغام ان کے افسانوں میں مختلف روپ میں ابھرتا ہے البتہ حق و باطل اور اچھائی اور برائی کے اس تصادم کی پیش کش میں کبھی کبھی ہاشمی صاحب جذباتی ہو جاتے ہیں جس سے ان کے احساس کی تڑپ کا احساس ہوتا ہے تاہم مشاہدے اور تجربے کی گہرائی اور شعور کی پختگی کی ان کے یہاں کمی نہیں ہے۔ اگر وہ یوں ہی 'مشق سخن' جاری رکھیں تو ایک دن دل کو چھو لینے والی کہانیاں ضرور تخلیق کریں گے۔

گوہرِ پس انداز
کا اجمالی جائزہ

• پروفیسر شمیم اختر
صدر، شعبۂ فارسی بنارس ہندو یونیورسٹی

پیش نظر افسانوں کا مجموعہ 'گوہر پس انداز' وسیم حیدر ہاشمی کی تخلیقی کاوش کا نتیجہ ہے۔ وسیم حیدر ہاشمی موجودہ افسانوی دنیا میں غیر معروف نام نہیں۔ اس سے قبل ان کے دو افسانوی مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے افسانے مختلف مؤقر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

ان کے قلم کا جوہر پروفیسر عبدالبسم اللہ کے ہندی ناول 'جھینی جھینی بینی چدریا' کے اردو ترجمے سے ظاہر ہوا اور وسیم حیدر ہاشمی نے آہستہ آہستہ اردو افسانوں کا زینا طے کرتے ہوئے معروف قلم کاروں کی صف میں اپنا مقام حاصل کر لیا۔ وسیم صاحب کے افسانوں سے زبان و بیان کی دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔ ساتھ ہی زمانۂ حال کے رجحان کے مطابق عنوانات بھی نہایت دلکش ہیں نیز مقصدیت بھی ظاہر ہے۔

مجموعہ 'گوہر پس انداز' میں شامل افسانوں سے محظوظ ہونے کے بعد قاری محسوس کرے گا کہ ایک نقاش اپنی دوسری تخلیق کو پہلی تخلیق سے بہتر بناتا ہے۔ زبان و بیان کے بارے میں اتنا ہی کہنا کافی معلوم ہوتا ہے کہ وہ حسب ضرورت الفاظ کا استعمال کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے۔ افسانے کا کردار کس جگہ سے تعلق رکھتا ہے یا کس علاقے کا ہے، وسیم صاحب کو بہت زیادہ زحمت نہیں کرنا پڑتی۔ وہ اسی مناسبت سے الفاظ، جملوں اور محاوروں کا تعین کرتے ہیں نیز مقصدیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ الفاظ کے گورکھ دھندھوں میں الجھ کر رہ جانا ان کو نہیں بھاتا بلکہ افسانہ نگار کے مقاصد بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ ہاشمی صاحب ایک حساس دل شخصیت کے مالک ہیں۔ سماج کے ہر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھیں مذہب و ملت سے کوئی سروکار نہیں۔ انھیں افسانوں کے لیے مواد کی فراہمی میں تگ و دو نہیں کرنا پڑتی بلکہ عنوانات ان کی نظر میں ہر لمحہ پیش نظر رہتے ہیں۔ کوئی خوش گوار واقعہ ہو یا رنج و غم کا حادثہ، ان کا دل جلد متاثر ہوتا ہے اور اس کی تصویر الفاظ کے جامے میں آراستہ کر کے قارئین کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں صرف سماجی، سیاسی اور اقتصادی مسائل پیش نہیں رہتے بلکہ پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ مسائل کے حل بھی تلاش کیے جائیں خواہ ''معزز لٹیرے، فسادیوں کا مذہب'' ہو یا ''کتے کا ایکسیڈنٹ'' سبھی نہایت پراثر اور دلچسپ انداز میں ظاہر کرتے ہیں۔

راقم کو قوی امید ہے کہ آپ بھی ان افسانوں سے محظوظ ہوں گے۔

معقول رشتہ

شگفتہ کی وِلادت پراُس کے والد، ماسٹرعلیم بخت بہت مسرور تھے۔ جب کہ ماں اُس کی سانولی رنگت اور معمولی شکل وصورت کے سبب کافی بجھی بجھی سی نظر آ رہی تھی۔ پہلے دن سے ہی اُسے ایسامحسوس ہونے لگا تھا کہ اِس کی شادی کے لیے باپ کی جوتیاں گِھس جائیں گی۔ شادی کے سلسلے میں آج کل ہر کوئی لڑکیوں کو دیکھنے کا خواہاں ضرور ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دیکھنے میں سوائے صورت کے اور دیکھا بھی کیا جاتا ہے۔ خوبصورتی کے بعد زیادہ جہیز کو ہی لڑکیوں کی شادی میں معاون تصور کیا جاتا ہے مگر اُسے تو اِس کا بھی آسرا نہیں تھا کیوں کہ پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے اس کی توقع بھی نہیں تھی۔ بس اُسے یہی فکر لاحق تھی۔ جبکہ ماسٹر علیم بخت، بیٹی کی طرف سے قطعی مطمئن تھے۔ اُنھوں نے شگفتہ کی پرورش وپرداخت بڑے سلیقے سے کی۔ والدین کی خاص توجہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر درجہ میں امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کرنے والی شگفتہ کو بہت جلد ایک اچھی نوکری بھی مل گئی تھی۔ اب شگفتہ کے لیے اُس کے معیار کا لڑکا تلاش کرنا اُس کے والدین کے لیے ان کی زندگی کا سب سے بڑا چیلنج بن گیا تھا۔ اس کے والد کو اچھے سے اچھے لڑکے میں کوئی نہ کوئی ایسی کمی ضرور نظر آ جاتی جسے نظر انداز کرسکنا آسان نہ ہوتا۔ گزشتہ تین برسوں سے مسلسل یہی سب چل رہا تھا۔ اس کے والد کی خواہش تھی کہ شگفتہ کے شوہر میں خوبیاں ہی خوبیاں ہوں۔ کسی قسم کی خامی یا کمی سے وہ سمجھوتا کرنے کو تیار نہ تھے۔ شاید اسی سبب شگفتہ کی شادی میں تاخیر پر تاخیر ہوتی جا رہی تھی۔ ایک روز شگفتہ کی والدہ نے اِس مسئلے پر شوہر کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"حیرت ہے کہ شگفتہ جیسی لڑکی کے لیے ایک معقول رشتہ ملنے میں اتنی دیر ہوتی جارہی ہے جبکہ ہمارے خاندان اور محلے پڑوس میں شگفتہ کی ہم عمر اور معمولی شکل وصورت والی گھریلو لڑکیوں تک کی شادیاں آسانی سے ہوتی جارہی ہیں۔ مجھے تو اب شگفتہ کی طرف سے فکر بڑھتی جارہی ہے"۔ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوئیں تو ماسٹر علیم بخت نے فخریہ انداز میں کہا کہ "بھئی میں اپنی افسر بیٹی کے لیے ایک دم اُسی کے معیار کا لڑکا چاہتا ہوں۔ پڑھا لکھا، اچھی نوکری، نیک اور شریف ...... ایکدم بے عیب"۔ انھوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"پڑھا لکھا اور نیک تو اکرم صاحب کا لڑکا رئیس بھی ہے۔ برادری اور سماج میں ان کی کیا عزت اور وقار ہے۔ اکرم صاحب کی بھی دلی خواہش ہے کہ وہ شگفتہ کو اپنی بہو بنائیں۔ ان کی اہلیہ کئی مرتبہ دبی زبان سے کہہ بھی چکی ہیں۔ جہاں تک بے عیب ہونے کا سوال ہے تو ایسا لڑکا ملنا ناممکن ہے۔ کسی نہ کسی نہج پر تو ہر انسان کو سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے، اپنے اصولوں سے بھی"۔ علیم بخت، اہلیہ کی باتیں غور سے سن رہے تھے۔ چند منٹوں کے بعد اُنھوں نے آہستہ سے کہا۔

"واقعی، بے عیب ذات تو صرف خدا کی ہے۔ شاید میرے سوچنے کا طریقہ غلط ہے۔ جہاں تک اکرم صاحب کے بیٹے کا سوال ہے، اس میں تمام اچھائیاں ہیں مگر اس کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے۔ نئی نئی وکالت شروع کی ہے۔ کسی روز سو پچاس مل جاتے ہوں گے اور کبھی تو وہ بھی نہیں .....بس یہی سوچ کر من ذرا ہچکچاتا ہے"۔ ان کا انداز متفکرانہ تھا۔

"ارے ماسٹر صاحب، جب آپ سے میری شادی ہوئی تھی، اس وقت تو آپ بی۔ اے۔ کر رہے تھے۔ رئیس تو پھر بھی وکیل ہے۔ کم ہی سہی، کماتا تو ہے نا۔ آج جونیئر ہے تو کل سینیئر بھی ہوگا۔ پھر اکرم صاحب کے یہاں کس چیز کی کمی ہے۔ مجھے تو اس کا مستقبل

روشن نظر آتا ہے۔ ارے بھئی، انسان کو کچھ خدا پر بھی چھوڑ دینا چاہیے۔ مادیت سے کنارہ کشی کر کے انسان اگر قناعت پسند ہو جائے تو اُس کو ذہنی سکون ضرور ملتا ہے، جو بڑی نعمت ہے''۔ وہ شوہر کو اس طرح سمجھا رہی تھی جیسے امام اپنے ماموں کو درس دیتا ہے۔

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ روزی فراہم کرنا تو رب العزت کا کام ہے۔ روزی قلیل ہو یا کثیر، یہ معنی نہیں رکھتا بلکہ روزی میں برکت زیادہ معنی خیز ہوتی ہے۔ پھر ہماری بیٹی کی تنخواہ بھی الحمد للہ، بہت ہے۔ ٹھیک ہے، مَیں آج شام شگفتہ کے رشتے کے لیے اکرم صاحب سے ملتا ہوں''۔ اب دونوں مطمئن نظر آ رہے تھے۔

جب اکرم صاحب نے اہلیہ کو بتایا کہ آج ماسٹر صاحب اپنی بیٹی کا رشتہ لے کر آنے والے ہیں تو وہ زیادہ خوش نہیں ہوئیں بلکہ تقریباً کچھ بدظن سی ہو کر کہنے لگیں کہ ''ارے بھئی، یہ بھی کوئی رشتہ ہوا۔ ہمارا رئیس اِتنے بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ اُس کی شادی کم سے کم کسی کلکٹر یا نواب زادی سے ہونی چاہیے۔ ہر چند کہ ماسٹر صاحب کی بیٹی خود بڑی افسر ہے مگر مجھے ایک معمولی سے اسکول ماسٹر کو اپنا سمدھی بنانا اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ پھر شگفتہ کی صورت شکل؟ اللہ ہمیں معاف فرمائے۔ ہمارے رئیس کے لیے کیسے اچھے اچھے رشتے آ رہے ہیں۔ صدیقی صاحب کی لڑکی تو واقعی چاند کا ٹکڑا ہے۔ آپ تمام رشتوں کو نظر انداز کر کے رئیس کی شادی ایک اسکول ماسٹر کی بیٹی سے کریں گے۔ مجھے یہ رشتہ قطعی پسند نہیں''۔ اُنھوں نے وثوق کے ساتھ اِنکار کا سبب بتایا تو اکرم صاحب نے اُنھیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تمہارا بیٹا بھی تمھاری طرح ہی پیدائشی گھامڑ ہے۔ اس کے نزدیک دنیا میں نہ کوئی مسئلہ ہے نہ اُس کا حل۔ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور مقدر۔ وہ میٹرک میں دو مرتبہ فیل ہوا اور بی۔اے۔ میں بھی۔ حقیقتاً وہ کسی محکمہ میں چپراسی بننے کے لائق بھی نہیں ہے۔ اگر وہ چپراسی یا کلرک بھی ہوتا تو ہر ماہ ایک طے شدہ رقم تو گھر لاتا، جو کم از کم اس کے

باورچی خانے کے اخراجات کی ضمانت ہوتا۔ وکالت میں تو اپنے بل بوتے سو پچاس بھی نہیں کما سکتا۔ اور یہ وکالت کا امتحان بھی میں نے اسے اپنے رسوخ کے بل پر پاس کروایا تھا تا کہ کم از کم وہ 'وکیل صاحب' تو کہا جاے۔ مجھے تو اپنے بیٹے کے لیے کوئی ایسی ہی لڑکی چاہیے تھی جس سے ہمارے بیٹے کا مستقبل اطمینان بخش ہو سکے۔ کل کو نہ تو ہم لوگ زندہ رہیں گے نہ ہی تمہاری پسند کی ہوئی چاند جیسی لڑکی کی چاندنی ہی برقرار رہے گی۔ صورت شکل چار دنوں کی ہوتی ہے بیگم۔ خود کو خوش قسمت سمجھو رئیس کے لیے اتنی بڑی افسر لڑکی کا رشتہ آیا ہے"۔ انھوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو ان کی بیوی نے مخالفت کیے بغیر یہ کہتے ہوے اِس رشتے کے لیے حامی بھر لی کہ "آپ چالیس برس تک ایک بڑے عہدے پر فائز رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آپ کے پیشے میں جذبات کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ لیکن میرے خیال سے یہ رشتہ مناسب نہیں ہے۔ ہمارا بیٹا اپنی بیوی کے سامنے ہمیشہ احساس کمتری کا شکار رہے گا جو اچھی بات نہیں"۔ وہ کافی بجھی بجھی سی نظر آ رہی تھیں۔

"مگر میں تو قطعی مطمئن ہوں۔ اس لیے کہ رئیس کی زندگی عیش سے گزرے گی۔ آج کل بیشتر چالاک والدین اپنے کم پڑھے لکھے، ناکارہ اور زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والے بچوں کو کچھ ایسی تعلیم ضرور دلوا دیتے ہیں جو سننے میں بھلی معلوم ہو، چاہے اپنے بل بوتے بیوی بچوں کے اخراجات بھی پورے نہ کر سکے۔ ایسے لوگ تلاش کر کر کے ایسی ہی بہویں لاتے ہیں جو اُن کے بیٹے کی زندگی بھر کفالت کر سکے۔ چنانچہ میں نے بھی ایسا ہی کیا اور یہی سمجھداری بھی ہے۔ میرے نزدیک رئیس کے لیے یہی رشتہ معقول ہے"۔ اتنا کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیے۔

شگفتہ کی اچھی نوکری کے سبب چونکہ اکرم صاحب کی نگاہ میں وہ گھر پہلے سے ہی ہدف بنا ہوا تھا، اس لیے رشتے کی بات کے ساتھ ہی شادی کی تاریخ بھی طے ہوگئی اور آئندہ پندرہ دنوں میں ہی دونوں گھرانے اپنے اپنے مذہبی اور سماجی فرائض سے راضی بہ

رضا، سبک دوش ہوگیے۔ دونوں گھروں میں آج سب سے زیادہ مسرور اکرم صاحب تھے۔ انھیں ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے آج ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بحسن وخوبی پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہو۔

شادی کے بعد شگفتہ اور رئیس کی زندگی کے اوّل چھ ماہ پلک جھپکتے گزر گئے۔ صرف سیر وتفریح، مارکیٹنگ اور اکثر وبیشتر رات کا کھانا ہوٹلوں میں ہی ہوجاتا تھا۔

چونکہ رئیس کی کوئی خاص آمدنی نہیں تھی اس لیے شگفتہ کے ملنے جلنے والے جب بھی اُس سے رئیس کی آمدنی یا اس کی جانب سے ملنے والے تحائف کا ذکر کرتے تو وہ بڑی خوبصورتی سے ٹال جاتی مگر شوہر کی ناکردہ کاری کے سبب وہ چاہ کر بھی اپنے چہرے سے شرمندگی اور ندامت چھپا نہیں پاتی تھی۔ وہ لمحہ اس کے لیے بہت تکلیف دہ ہوتا تھا۔ ہر چند کہ اسے شوہر کے پیسوں کی کوئی ضرورت نہیں تھی پھر بھی اکثر اس کا دل چاہتا تھا کہ شوہر اس کے لیے اپنی کمائی سے کچھ کرے مگر اس نے آج تک رئیس پر کچھ بھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ شگفتہ ہی نہیں کبھی کبھار رئیس کے دوست اور گھر خاندان والے بھی موقع تاڑ کر چبھتے ہوے تیر اُس پر پھینک ہی دیا کرتے تھے، جسے وہ قدرے شرمندگی کے ساتھ برداشت کرلیتا تھا۔ اِنھیں وجوہات سے وہ دونوں اب ذرا بجھے بجھے سے رہنے لگے تھے۔

آج ہفتے کی شام تھی اور مطلع ابر آلود ہونے کے سبب موسم خوش گوار ہوگیا تھا۔ شگفتہ کا دل آج تفریح کے لیے شدت سے مچل رہا تھا۔ اس نے رئیس سے سنٹرل پارک چلنے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے انکار کردیا۔ ”آج میرا دل نہیں چاہ رہا ہے۔ کسی اور دن چلیں گے“۔ اس کا مختصر سا جواب تھا۔

”لیکن کیوں؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“۔ شگفتہ نے اس کی پیشانی پر اپنے نرم و نازک ہاتھ رکھتے ہوے سوال کیا۔

”نہیں، میں ٹھیک ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بس یوں ہی......“۔ اس کا لہجہ

مایوس کن تھا۔

''بس یوں ہی......! بس کیا؟ تمھیں بتانا پڑے گا۔ کوئی خاص وجہ ضرور ہے''۔ شگفتہ نے اصرار کیا۔

''شگفتہ ڈارلنگ! گزشتہ چھ ماہ میں تم نے مجھے اچھی طرح سے پہچان لیا ہوگا، میری ہر حرکات وسکنات سے میری ذہنی کیفیت کا اندازہ تم ہمیشہ ایکدم صحیح لگالیتی ہو۔ لیکن اس دوران میں جن کش مکش اور ذہنی اذیتوں سے گزر تا رہا ہوں، ان کا اندازہ میرے سوا شاید کسی کو نہیں ہوسکتا......وہ لمحہ میرے لیے کتنا گراں بار ہوتا ہے جب کوئی ٹیکسی والا، ہوٹل والا یا کوئی دوکاندار، بل کے پیسے ادا کرنے کے لیے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ ان لمحات کا اندازہ تمھیں کبھی نہیں ہوسکتا۔ میں اُن سبھوں کی نگاہوں میں کتنا کمتر ہو جاتا ہوں اور خود کتنا بے بس۔ اس کا اندازہ.....! میں بے حس نہیں ہوں شگفتہ ڈارلنگ''۔ اتنا کہتے کہتے اس کی آواز بھرّا گئی۔

''بس رئیس، بس۔ پلیز ایسی باتیں مت کرو۔ میرا دل بہت کڑھتا ہے۔ تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ تمہاری اس کیفیت کا اندازہ مجھے نہیں ہے؟ مجھے مال و دولت کی کوئی کمی نہیں۔ بے حساب خرچ کرتی ہوں پھر بھی اپنی تنخواہ کا نصف بھی نہیں خرچ کر پاتی۔ ان سب کے باوجود میری دلی خواہش ہے کہ تمھاری بھی ذاتی آمدنی ہو۔ ہر چند کہ مادہ پرست لوگوں نے پوری دنیا کے گرد مادیت کا ایسا مضبوط حصار بنادیا ہے کہ تمام عالم اس میں مقید ہوکر رہ گیا ہے۔ ایسے انسان کا شمار انگلیوں پر کیا جاسکتا ہے جن کے ذہن مادہ پرستی سے پاک ہوں۔ مجھے فخر ہے کہ تم بھی ان میں سے ایک ہو۔ پھر بھی میرا دل چاہتا ہے کہ تم مجھے اپنے پسند کے تحائف لاکر دو۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن ایسا ضرور ہوگا''۔ شگفتہ کی نگاہوں میں رئیس کے تئیں اعتماد صاف جھلک رہا تھا۔

''کبھی نہ کبھی نہیں شگفتہ۔ ایسا ہو چکا ہے۔ تمھیں یہ خوش خبری سنانے کے لیے

مَیں کسی معقول موقعے کی تلاش میں تھا کہ تمھیں یہ بتا سکوں کہ دہلی کی ایک بہت بڑی بین الاقوامی کمپنی نے میری تقرری لیگل ایڈوائزر کے عہدے پر کر لی ہے۔ ستر ہزار روپے ماہانہ تنخواہ کے ساتھ پانچ کمروں پر مشتمل ایک خوبصورت فلیٹ اور خدمت کے لیے کمپنی مجھے ایک ملازم بھی دے گی۔ فلیٹ کی رقم تنخواہ سے کٹتی رہے گی۔ بس، تم سے دوری کے خیال سے من بجھ سا جاتا ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے خوبصورت مور ناچتے ناچتے اپنے بدصورت پیر دیکھ کر رک جاتا ہے''۔

یہ سن کر شگفتہ ایک دم سے اُچھل پڑی۔

'' آج اگر مجھے کوئی تمام دنیا کی سلطنت بھی دے دیتا تو مجھے وہ خوشی ہرگز نہ ہوتی جو خوشی یہ مبارک خبر سن کر ملی ہے۔ تم پہلی فرصت میں دہلی کے لیے نکل پڑو۔ جہاں تک مجھ سے دوری کا سوال ہے تو ایسا خیال بھی کبھی اپنے ذہن میں نہ لانا۔ ارے رئیس صاحب، فاصلے زمینوں کے نہیں بلکہ ذہنوں کے ہوا کرتے ہیں۔ تم کیا سمجھتے ہو، کیا تم سے دور رہ کر میں چین سے زندہ رہ سکوں گی؟ ہرگز نہیں۔ میں بھی جلد از جلد اپنا تبادلہ وہیں دہلی میں کروالوں گی۔ ہم ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بن چکے ہیں رئیس''۔ شگفتہ کے چہرے پر خوشی کی سرخی صاف نظر آ رہی تھی۔ ایک ایسی خوشی جو اسے اپنی نوکری ملنے کی خبر سن کر بھی نہیں ہوئی تھی۔ اور دونوں سیر کی غرض سے سنٹرل پارک کے لیے نکل پڑے۔

●

سلام روستائی

سفر مختصر ہو یا طولانی، ہر معقول شخص اُس سے پرہیز کی کوشش ضرور کرتا ہے پھر بھی ریل گاڑیوں اور بسوں وغیرہ کی حالت کا جائزہ لیجیے تو اندازہ ہوگا کہ سفر کرنا بیشتر افراد کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔ ناقابل برداشت گرمی ہو یا ہڈیاں جما دینے والی ٹھنڈ، کسی بھی بس یا ریل گاڑی میں سکون سے بیٹھنے کی جگہ حاصل کرسکنا، کوشش سے زیادہ قسمت پر منحصر ہوتا ہے۔ عوام میں زیادہ تر ایسے افراد ملیں گے جو بسوں کی نسبت ریل گاڑی کے سفر کو فوقیت دیتے ہیں۔

بسنت لال، آنکھیں بند کیے اپنی برتھ پر لیٹا یہی سب سوچتا ہوا خود کو اُن خوش قسمت لوگوں میں شمار کر رہا تھا جنھیں ریل گاڑیوں میں برتھ مل جاتی ہے۔ یوں تو ممبئی سے شروع ہو کر اُس کے گاؤں کے ریلوے اسٹیشن تک کا یہ سفر، ریلوے ٹائم ٹیبل کے مطابق بیالیس گھنٹوں کا تھا مگر بلاوجہ کی چین پُلنگ اور گاڑیوں کی کراسنگ وغیرہ کی وجہ سے اُسے گاڑی میں بیٹھے ہوئے تقریباً ساٹھ گھنٹے گزر چکے تھے مگر اب تک اس کی گاڑی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ گاڑی کے اٹھارہ گھنٹوں تک لیٹ ہو جانے کے سبب وہ اِس طولانی سفر سے بے انتہا اوب چکا تھا۔ پھر بھی اس کی دلی خواہش یہی تھی کہ کاش یہ گاڑی چار گھنٹے اور لیٹ ہو جاتی تو اچھا ہوتا۔ کیوں کہ جس ریلوے اسٹیشن پر اُسے اُترنا تھا، وہاں سے اس کے گاؤں تک کی مسافت پانچ کلومیٹر کی تھی۔ ریلوے اسٹیشن سے گاؤں تک جانے کے لیے اُسے یکے کا سہارا تھا۔ اگر گاڑی شب کے دو بجے اسٹیشن پر پہنچے گی تو اسے کم از کم چار گھنٹے تو پلیٹ فارم پر ٹہل گھوم کر ہی گزارنے ہوں گے جو بہر صورت، اس طویل سفر سے

زیادہ تھکا دینے والا ہوگا۔ اتنی رات گئے اس کے گاؤں تک جانے کے لیے کوئی سواری تو ملنے سے رہی۔ اسی لیے اس کی دلی خواہش تھی کہ یہ گاڑی چار گھنٹے مزید لیٹ ہو جاتی تو بہتر تھا مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ گاڑی سوا دو بجے شب میں جب شاہ گنج کے سنسان اور ویران ریلوے اسٹیشن پر رُکی تو بسنت لال، جو کہ اپنے سامان پہلے ہی سمیٹ چکا تھا، بڑبڑاتا ہوا جلدی سے گاڑی سے اُتر گیا کہ ''بیچارے ریلوے وا.لے، اُن کی قسمت میں شاید مسافروں کی دعائیں ہیں ہی نہیں۔'' ریل گاڑی اس اسٹیشن پر دو تین منٹ ٹھہر کر چل دی اور پھر چہار سمت پہلے جیسا سناٹا پھیل گیا۔ بسنت لال نے اپنا سامان اٹھایا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک خالی بنچ کے پاس آیا اور سامان سمیٹ کر اس پر بیٹھ گیا۔ تکان اور سستی کے باعث نیند اس پر حاوی ہوتی جا رہی تھی مگر سامان چوری ہو جانے کے ڈر سے اُس نے سونا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ بنچ پر بیٹھ کر اونگھنے لگا۔ ابھی پانچ منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ 'بنارس سے لکھنؤ جانے والی میل بس کے آنے کا وقت تو ہو گیا ہے۔ وہ تین بجے بھور میں شاہ گنج پہنچتی ہے اور یہاں سے چھوٹنے کے بعد بمشکل تمام دس منٹ میں اس کے گاؤں تک پہنچا دے گی۔ مگر یہ کمبخت تو میل بس ہے۔ گاؤں کے چوراہے پر رُکے گی بھی نہیں۔ ہاں اگر میں سلطانپور تک کا ٹکٹ لے لوں اور بس والے سے گذارش کروں تو وہ شاید مجھ پر ترس کھا کر گاؤں کے چوراہے پر گاڑی رکوا دے۔ ٹھیک ہے، کوشش کرنے میں کیا ہرج ہے؟ یہاں پر تمام رات بیٹھے رہنے سے تو اچھا ہے کہ بس اسٹینڈ ہی چلا جائے۔'

اور یہی سوچتے ہوئے اس نے ایک بار پھر سے سامان سمیٹا اور پیدل ہی بس اسٹینڈ کی طرف چل دیا۔ ریلوے اسٹیشن سے بس اسٹینڈ کا فاصلہ کوئی آدھے کلومیٹر کا تھا۔ وہ راستے بھر یہی سوچتا جا رہا تھا کہ 'یہاں سے گاؤں تک کا بس کا کرایہ صرف دو روپیہ ہوتا ہے مگر میل بس کی وجہ سے اسے ناحق اسّی روپے خرچ کرنے ہوں گے۔' ایسا ہے کہ اگر

میں بس کنڈکٹر کو دس روپے دے دوں تو وہ مجھے گاؤں کے چوراہے پر اُتار دے گا........ اگر کنڈکٹر سخت مزاج ہوا تو شاید ہی میری بات مانے۔ ہوسکتا ہے کہ بس میں چڑھنے بھی نہ دے۔ خیر، دیکھا جائے گا۔'

یہی سب سوچتا ہوا جب وہ بس ڈِپو میں پہنچا تو دیکھا کہ وہاں زیادہ سنّاٹا نہیں ہے بلکہ وہاں پر چھ سات مسافر پہلے سے موجود تھے، جو شاید اُسی بس کے منتظر تھے۔ ابھی اس نے اپنا سامان رکھا ہی تھا کہ روڈویز کی ایک لمبی سی بس، دندناتی ہوئی ڈپو میں آکر کھڑی ہوگئی۔ جتنی دیر میں کنڈکٹر دفتر میں جاکر اپنے اِراوَل اور ڈِپارچر کا اندراج کرواتا، دوسرے مسافروں کے ہمراہ بسنت نے بھی اپنا سامان بس میں ٹھونسا اور بس کے دروازے کے پاس ہی کھڑا ہوگیا۔ بس میں بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔

دومنٹ بعد ہی کنڈکٹر واپس بس میں چڑھا اور بس چل دی۔ کنڈکٹر نے تمام مسافروں کو مخاطب کرتے ہوئے تقریباً چلّا کر کہا۔

''اس گاڑی میں کیول سُلطانپور اور لکھنؤ کے پیسنجر ہی بیٹھیں۔ یہ میل بس ہے۔ راستے میں اور کہیں نہیں رُکے گی۔ کادی پور یا سوراپور ابھی نہیں رکے گی۔ شاہ گنج سے جو پیسنجر بیٹھے ہیں وہ لوگ اپنا اپنا ٹکٹ بنوالیں۔ کیول سلطانپور اور لکھنؤ۔''

ایک مسافر نے کہا کہ ایک ٹکٹ لکھنؤ کے لیے بنا دیجیے تو دوسرے نے سلطانپور کے لیے دو ٹکٹ بنانے کی خواہش ظاہر کی۔ جب کوئی ٹکٹ بنوانے والا نہیں رہ گیا تو کنڈکٹر نے بس میں سوار مسافروں کی گنتی شروع کردی۔ اس کی گنتی، ٹکٹ کی بکری سے میل نہیں کھا رہی تھی۔ ایک مسافر بڑھ رہا تھا۔ کنڈکٹر نے پھر چیخ کر کہا۔

'' گاڑی میں کون ہے جس نے ابھی تک ٹکٹ نہیں بنوایا؟ وہ ٹکٹ فوراً بنوالے ورنہ پکڑے جانے پر گاڑی روک کر اسے بیچ راستے میں اُتار دیا جائے گا...... ارے گاڑی میں کون بغیر ٹکٹ ہے؟ کوئی بولتا کیوں نہیں جی؟'' سڑک سناٹی ہونے کے سبب بس پوری

رفتار سے دوڑی جارہی تھی۔ بسنت کا گاؤں اب یہاں سے تقریباً آدھا کلومیٹر رہ گیا تھا۔

"بس میں کون بنا ٹکٹ کے چل رہا ہے جی۔ کوئی بولتا کیوں نہیں.....؟"

کنڈکٹر نے تمام مسافروں کو گھڑ کا تو بسنت لال نے کہا۔

"کنڈکٹر بابو، ہمار ایک ٹھے ٹکس بنائے دیو۔" اتنا کہہ کر وہ جیب سے پیسے نکالنے لگا۔

"ابھی تک سو رہے تھے کیا جی؟ بولو، کہاں جانا ہے؟"

"آجم گڑھ جائے کے ہے۔ کتنا دے ای؟" یہ سن کر کنڈکٹر کا پارا ایکدم سے چڑھ گیا۔

"بڑا گدھا ہے بے تو۔ ارے پاگل ای آجم گڑھ روٹ نہیں ہے۔ لکھنؤ روٹ ہے۔ کبّے سے چلائے رہا ہوں کہ کھالی سلطانپور اور لکھنؤ والے پسنجر بیٹھیں.....دھت تیری کی۔ ای پاگل، سالا دیہاتی......گاڑی روکا ہو ڈرائیور ساب۔ اُتارا، ای گدھا کے ہیاں سون سان جنگل میں تب ایکر بدھی ٹھیک ہوئی۔" بس کے بریک چیخے اور وہ بس، بسنت کے گاؤں کے چوراہے پر ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گئی۔

"چلا اُترا۔ ساری رات ہیاں ٹھنڈک میں کوکوآ۔ پاگل، دیہاتی، بے کو پھ ناہیں ت۔" اور بسنت لال اپنا سامان سمیٹ کر اپنے گاؤں کے چوراہے پر اُتر گیا۔

●

تپلی گلی

ایک شخص جہیز میں ملی نئی موٹر سائکل پر سوار، برق رفتاری سے اُڑا جا رہا تھا۔ گاڑی پر ابھی نمبر تک نہیں پڑا تھا۔ سامنے مجمع دیکھ کر اس نے گاڑی کی رفتار کم کر دی۔ اس بھیڑ میں عوام کے ساتھ چند پولس والوں کو دیکھ کر اس کا دماغ ٹھنکا۔ اسے یہ سمجھتے دیر نہیں لگی کہ معاملہ کیا ہے۔ موٹر سائکل کے کاغذات چک کیے جا رہے تھے۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے کیوں کہ گاڑی کے کاغذات درست نہیں تھے۔ اُسے فوراً گھر پہنچنا تھا اور اِس ایک راستے کے سوا کوئی ایسی تپلی گلی بھی نہیں تھی جس سے وہ بخیر و عافیت نکل جاتا۔ اس ناگہانی مصیبت سے بچنے کے لیے وہ طرح طرح کی ترکیبیں سوچنے لگا مگر پولس کے خوف نے جیسے اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیت ہی سلب کر لی تھی۔ اس نے موٹر سائکل کو اِسٹینڈ پر کھڑا کیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا پان کی ایک دوکان پر جا کر رُک گیا۔ اُس نے اطمینان کے ساتھ ایک پان منھ میں دابا اور پان والے سے تھوڑا سا چونا لے کر موٹر سائکل کی سادہ نمبر پلیٹ پر جلی حروف میں POLICE لکھ کر چند منٹوں تک اس کے خشک ہونے کا انتظار کیا۔ اِس کے بعد اُس نے موٹر سائکل اِسٹارٹ کی اور نہایت اطمینان کے ساتھ پولس والوں کے سامنے موٹر سائکل لے کر پہنچا تو ایک داروغہ نے ایک مرتبہ نمبر پلیٹ کو دیکھا اور پھر سوار کو۔ داروغہ سے نظریں ملتے ہی اس نے آہستہ سے کہا "جے ہند سر" تو اس نے سر کے خفیف اشارے سے اس کی موٹر سائکل کو بغیر کسی جانچ کے آگے بڑھ جانے دیا۔

گوہرِ پس انداز

اِس شادی کے لیے نہ تو حاجی عزیزالدین کا گھرانا راضی تھا نہ ہی اکرام حسین کا۔ وجہ یہ تھی کہ ان دونوں کی اولادیں ابھی کمسن اور زیرِ تعلیم تھیں۔ حاجی عزیزالدین کا بیٹا محمد ناظم علی انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا جبکہ اکرام حسین کی بیٹی، دینا نویں جماعت کی۔ مگر کینسر جیسے مہلک مرض کے شکار ضعیف العمر والد کی خواہش کے پیش نظر دونوں گھرانوں کو سرنگوں ہونا پڑا۔ دونوں بھائیوں، حاجی عزیزالدین اور اکرام حسین نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے والد کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے فی الحال دونوں کا نکاح کر دینے کو اپنی سعادت تصور کیا اور یہ کارِ خیر بحسن وخوبی انجام بھی پا گیا۔

ایک روز دینا کی اچانک گمشدگی کے باعث یہ گھرانا بہت پریشان ہوا۔ برسوں اس کی تلاش کے بعد تمام لوگ تقریباً نا امید ہو کر بیٹھ گیے تھے اور ناظم، جو کہ اب ایک اعلیٰ پولیس افسر بن چکا تھا، اس کی دوسری شادی کی جستجو میں اس کے والدین منہمک تھے مگر ناظم علی، آج گیارہ برس کے بعد بھی دینا کی طرف سے قطعی نا امید نہیں ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے قوی امید تھی کہ اس کی گمشدہ بیوی دینا، ایک نہ ایک روز اسے ضرور مل جائے گی چنانچہ اس نے دوبارہ شادی سے قطعی انکار کر دیا تھا۔

دینا نے اپنی زندگی کے گیارہ برس، جسم فروشوں کے درمیان، گمنامی کے اندھیروں میں نہایت خاموشی اور صبر وشکر کے ساتھ گزارے تھے۔ گزشتہ گیارہ برسوں میں ہر "نا" پر اُسے سخت ترین ایذا اسے گزرنا پڑا تھا چنانچہ تھک ہار کر اس نے اِس لعنت زدہ زندگی کو بادل ناخواستہ قبول کر لیا تھا۔ اس دوران وہ ایک بچی کی ماں بھی بن چکی تھی۔ اب

چونکہ جسم فروشوں کے گروہ نے اس سے اپنے تعلقات تقریباً منقطع کر لیے تھے اس لیے وہ خود کو کافی حد تک آزاد اور خود مختار تصور کرنے لگی تھی۔ اس دوران کچھ دلالوں نے اس کا رابطہ شہر کے بدنام ہوٹلوں سے قایم کروا دیا تھا جس کے سبب اس نے اپنے ایک ذاتی گھر کے ساتھ بے حساب دولت بھی جمع کر لی تھی۔ اس ذلت اور بے عزتی کی زندگی سے وہ اس قدر بیزار تھی کہ اب اس شہر کو چھوڑ کر کہیں اتنی دور چلی جانا چاہتی تھی جہاں اس کی بچی پر ان بدنامیوں کا سایہ بھی نہ پڑنے پاے۔ اب اس کی باقی ماندہ زندگی کا مقصد، صرف اپنی معصوم بچی کی پرورش اور بہتر تعلیم و تربیت تھا۔ اب، بدنام ہوٹلوں کے دلالوں کی نگاہوں سے بچ کر نکلنا اس کا اصل ہدف تھا۔ یہاں سے خاموشی کے ساتھ فرار اختیار کرنے کے سلسلے میں اس نے ایک پراپرٹی ڈیلر سے رابطہ قایم کر کے اپنے گھر کو راتوں رات اچھی قیمت پر ایسی خاموشی کے ساتھ فروخت کر دیا کہ پڑوسیوں تک کو اس کی ہَوا نہ لگ سکی۔

دینا اپنی بیٹی جوہی اور چند ضروری سامان کے ساتھ کسی کی نظر میں آے بغیر آج پانچ بجے صبح اس شہر سے ہزاروں میل دور، حیدرآباد پہنچ گئی تھی۔ کافی غور و خوض کے بعد اس نے ایک دھرم شالا میں قیام کیا۔ انھیں بھوک لگی تھی چنانچہ یہاں سے باہر نکلنے کے بعد ایک صاف ستھرا رستوراں دیکھ کر وہ دونوں ایک خالی کیبن میں داخل ہوگئیں۔ کچھ عرصہ کے بعد بیرا آیا تو اس کو ناشتے کا آرڈر دے کر دونوں اس کا انتظار کرنے لگیں۔

''امی جان، یہ تو بتایئے کہ اب ہم لوگوں کو یہاں سے کہاں جانا ہے اور میرے ایڈمیشن کا کیا ہوگا؟'' جوہی نے متفکرانہ لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں بیٹی۔ میں بھی اسی مسئلے پر غور کر رہی ہوں۔ اچھا یہ بتاؤ کہ کیا تمھیں انٹرنیٹ چلانا آتا ہے؟'' دینا نے دریافت کیا تو جوہی نے چہک کر کہا۔

''ہاں امی۔ مجھے انٹرنیٹ چلانا آتا ہے۔ کمپیوٹر کیا، میں تو موبائل پر بھی کبھی کبھار انٹرنیٹ چلا لیا کرتی ہوں مگر آپ کو انٹرنیٹ سے کیا کام ہے؟'' اس درمیان ناشتہ

آ گیا تھا۔ وہ دونوں ناشتے میں مشغول ہو گئیں۔ ناشتہ ختم کرنے کے بعد دینا نے جوہی سے کہا۔

''وہ دیکھو۔ سامنے اُس تختی پر لکھا ہوا ہے کہ 'یہاں پر انٹرنیٹ کی سہولت موجود ہے'۔ میں چاہتی ہوں کہ تم انٹرنیٹ کے ذریعے اپنے ایڈمیشن کے بارے میں معلومات حاصل کرو۔ یہی بہتر ہوگا۔ اس انجان شہر میں کسی غیر سے کچھ دریافت کرنا مناسب نہیں۔'' اور دونوں انٹرنیٹ کیبن میں داخل ہو گئیں۔

تقریباً نصف گھنٹے تک مکڑی کے اس جال میں الجھے رہنے کے بعد جوہی نے خوش ہو کر کہا۔

''امی، یہ دیکھئے۔ 'مدر میری کانونٹ' میں بورڈنگ کی سہولت موجود ہے اور داخلہ بھی چل رہا ہے۔ آن لائن فارم بھر کر جمع کرنے کی آخری تاریخ آج شام چار بجے تک ہے۔ اِس میں اسکول کا پتہ اور فون نمبر بھی درج ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اسکول کا پتہ اور فون نمبر نوٹ کر لیا اور اپنا فارم بھی آن لائن بھر دیا۔ کام تمام کر لینے کے بعد رستوراں کا بل ادا کر کے وہ دونوں باہر نکل آئیں اور دھرم شالا کی طرف چل دیں۔

دوسری صبح تقریباً نو بجے، دینا کے موبائل پر اسکول کی جانب سے یہ میسیج آیا کہ اسے آج شام چار بجے سے قبل بچی کی کاؤنسلنگ کے لیے اسکول پہنچنا ہے۔ مزید معلومات کے لیے انٹرنیٹ سے رجوع کرنے یا فون سے رابطہ کرنے کی ہدایت بھی شامل تھی۔ اسکول کی جانب سے یہ پیغام دیکھ کر خوشی سے دینا کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ انٹرنیٹ پر دیئے ہوئے نمبر پر اس نے فوراً فون ملا دیا۔ Goodmorning, mother marry's convent کی آواز پر دینا نے داخلے کے متعلق تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد جوہی کے ہمراہ اسکول جا پہنچی۔ کاؤنسلنگ اور تمام کاغذی کاروائی مکمل ہونے کے بعد دینا نے جوہی کو ہاسٹل وارڈن کے حوالے کرتے ہوئے اسے چند ہدایات دیں اور کل دوبارہ آنے

کا وعدہ کر کے اس سے رخصت لی۔ جب وہ اسکول سے باہر نکلی تو اپنی آج کی کامیابی پر بہت خوش تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ بیٹی سے دوری کا احساس اسے گراں گزر رہا تھا پھر بھی وہ خوش اور مطمئن تھی۔

کئی مرتبہ آتے جاتے دینا کو آٹو اسٹینڈ اور بازار کا خاصہ اندازہ ہو گیا تھا۔ دینا ایک آٹو رکشہ میں بیٹھ کر بازار کی طرف نکل پڑی۔ بیچ بازار پہنچ کر اس نے آٹو رکشہ والے کا کرایہ ادا کیا اور پیدل ہی گھوم ٹہل کر کچھ خوردنی اشیا، بسکٹ، پھل، خشک میوے وغیرہ خرید لیے تا کہ وقت ضرورت بار بار باہر نہ نکلنا پڑے۔ میوے کی دوکان سے نکلنے کے بعد وہ ایک کمپیوٹر کی دوکان میں داخل ہوگئی اور بیٹی کے لیے ایک اچھا سا لیپ ٹاپ خریدنے کے بعد اسے دوکاندار سے چلانا بھی سیکھا۔ لیپ ٹاپ کی قیمت ادا کر کے دوکان سے باہر نکل آئی۔ باہر نکل کر اس نے تھرمس میں چائے لی اور دھرم شالا کی طرف چل پڑی۔ دھرم شالا پہنچ کر پہلے اس نے کچھ پھل، میوے اور بسکٹ کھا کر اپنی بھوک مٹائی پھر ایک کپ چائے پی۔ اب وہ خود کو توانا اور تازہ دم محسوس کر رہی تھی۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اس نے لیپ ٹاپ کھولا اور اسے ماڈم کے ذریعے نٹ سے جوڑنے کے بعد تلاش کے خانے میں broker for purchase of residintial house in Hyderabad لکھ کر تلاش کا بٹن دبا دیا۔ چند سکنڈ میں ہی حیدر آباد کے متعدد مکان دلالوں کی سائٹ کھل گئی۔ انٹرنٹ کی جادوئی دنیا میں قدم رکھ کر وہ بہت خوش تھی۔ اس نے کئی دلالوں کے نام، پتے اور موبائل نمبر نوٹ کیے اور پھر لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ رات زیادہ گزر جانے کے سبب اس نے کسی دلال سے رابطہ کرنے کا ارادہ کل صبح تک کے لیے ملتوی کر دیا۔ دینا آج خود کو خوش، بے فکر اور بہت مطمئن محسوس کر رہی تھی۔ وہ کب سوگئی، اسے پتہ ہی نہیں چل سکا۔

○

ناظم نے اپنی بہتر کارکردگی کے سبب ڈپارٹمنٹ میں بہت جلد اثر و رسوخ قایم

کر لیے تھے۔ تمام اعلیٰ افسر اور ہوم منسٹر بھی اسے بہت عزیز رکھتے تھے۔ پیچیدہ اور ناممکن تصور کیے جانے والے ہر کام کے لیے ڈپارٹمنٹ، بیشتر اسی کا انتخاب کرتا تھا۔ وہ ایسا ہمتی اور جانباز افسر تھا کہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتا تھا چنانچہ اگر کسی ناجائز کام میں شہر کے کسی رئیس اعظم یا بارسوخ ہستی کے شامل ہونے کا اندیشہ ہوتا تو وہ کام ناظم کے سپرد کیا جاتا تھا۔ آج بھی آئی۔جی۔، ڈی۔آئی۔جی اور بہت سے اعلیٰ افسران کی ایک نشست ہوم منسٹر نے دارالحکومت میں منعقد کی تھی جس میں ناظم کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ تھوڑی دیر تک بحث و مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ یہ کیس چونکہ بہت پیچیدہ ہے اور اس میں بڑے بڑے رئیسوں کے شامل ہونے کا قوی اندیشہ ہے، اس لیے اس کیس کی تمام تر ذمہ داریاں ناظم کے سپرد کر دی جائیں۔ اس فیصلے کے بعد ہوم منسٹر نے ناظم سے مخاطب ہو کر کہا۔

''مسٹر محمد ناظم علی۔ آپ کی ایماندارانہ اور باہمت کارگردگی سے پورا محکمہ واقف ہے، اسی سبب پورے ڈپارٹمنٹ اور ہوم منسٹری کو آپ پر ناز ہے۔ مجھے امید ہی نہیں بلکہ یقین کامل ہے آپ دیگر پیچیدہ ترین کیسوں کے مانند، اس کیس کو بھی حل کر کے سماج کے تمام دشمنوں کو جلد از جلد کورٹ میں حاضر کر دیں گے۔ اس سلسلے میں مَیں آپ کو کچھ خصوصی اختیارات بھی دیتا ہوں جن کا استعمال آپ کو بہت سمجھداری سے کرنا ہوگا۔'' ان کی خاموشی کے بعد ناظم نے کہا۔

''مجھ پر اعتماد اور حوصلہ افزائی کے لیے میں عالی جناب کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ چھوٹی چھوٹی بچیوں کو ان کے اسکول اور دیگر مقامات سے اغوا کر کے انھیں جسم فروشی کے لیے مجبور کرنے والوں کے جس گروہ کے سلسلے میں یہ نشست منعقد کی گئی ہے، اس سلسلے میں میرا اندازہ ہے کہ اس گروہ کے آقا، جو ہمارے صوبے سے معصوم بچیوں کو اغوا کروا رہے ہیں، ان تمام کا تعلق ممبئی، دہلی اور حیدرآباد جیسے بڑے شہروں سے ہے۔ مجھے امید ہے کہ خدا کے فضل و کرم سے میں آپ کی امید سے قبل، ان کے گریبان پر ہاتھ

ڈالنے میں ضرور کامیاب ہوسکوں گا۔ آپ نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے جو خصوصی اختیارات مجھے دیے ہیں، اس کے لیے بھی میں عالی جناب کا شکر گزار ہوں۔'' اس کے بعد نشست ختم ہوگئی۔

○

دوسری صبح بستر سے اٹھنے کے بعد دینا نے تیار ہو کر ناشتہ کیا اور لیپ ٹاپ لے کر جوہی کے اسکول پہنچ گئی تا کہ اسے جوہی کے حوالے کرنے کے بعد اسے ساتھ لے جا کر کچھ ضروری سامان دلا دے۔ اسکول کے ہاسٹل پہنچ کر دینا نے جوہی سے تیار ہونے کو کہا اور اپنے موبائل فون سے مکان کے ایک دلال کو فون لگایا۔ اُدھر سے 'ہلو کی' آواز آئی تو دینا نے کہا:

''میں دینا بول رہی ہوں۔ کیا کشن چند پراپرٹی ڈیلر سے بات ہوسکتی ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''جی ہاں میم، میں کشن ہی بول رہا ہوں۔ کہیے آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''دراصل مجھے ایک گھر خریدنا ہے۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ بس گوش گزار کرا رہی ہوں۔ اگر موقع سے کوئی مناسب گھر نظر آجائے تو مجھے اسی نمبر پر مطلع کیجیے گا۔'' اسے جلدی تو تھی مگر اس نے اس لیے ظاہر نہیں کیا کہ کہیں جلد بازی کے سبب دلال اسے زیادہ قیمت نہ بتا دے۔

''جیسی آپ کی مرضی میم۔ ویسے ہمارے پاس چھوٹے بڑے متعدد گھر ہیں۔ بیس لاکھ سے لے کر چار کروڑ تک کے۔ آپ جب بھی دیکھنا چاہیں، موقع نکال کر خادم کو حکم کر دیجیے گا۔'' اس نے گھروں کی تفصیل بتانا چاہی تو دینا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ایک عدد چھوٹا فلیٹ کتنے روپے تک ممکن ہو سکے گا؟'' دینا نے چھوٹے فلیٹ کی قیمت جاننا چاہی۔

''فلیٹ بھی تیس لاکھ روپے سے دو کروڑ تک کی رینج میں مل سکیں گے۔ اگر آپ تھوڑا وقت نکال لیتیں تو آج ہی دکھا دیتا۔ ویسے جیسی آپ کی مرضی۔''

''ٹھیک ہے۔ میں ابھی مارکٹنگ کے لیے نکل رہی ہوں۔ آپ سے کہاں ملاقات ہو سکے گی؟'' اس نے دریافت کیا تو کشن نے کہا۔

''اگر مارکیٹنگ کی غرض سے آپ کا آنا نشاط سنیما یا ریگل کی طرف ہو تو وہیں پر میرا دفتر ہے، جہاں مجھ سے ملاقات ہو سکے گی۔'' اور اس نے دینا کو اپنے دفتر وہی پتہ نوٹ کروا دیا جو اس نے ویب سائٹ سے نوٹ کیا تھا۔ اس کے بعد اس نے جوہی کو ساتھ لیا اور ایک ٹیکسی میں سوار ہو کر بتائے ہوئے پتے پر نکل پڑی۔ تقریباً ایک گھنٹے کی بات چیت کے بعد دینا نے ایک اچھا بھلا فلیٹ تیس لاکھ روپے میں خرید لیا۔ وہ بے خوف اور ہمتی تو تھی ہی مگر یکے بعد دیگرے کامیابیوں کے سبب اس کی خود اعتمادی اب پہلے کی نسبت زیادہ بڑھ گئی تھی۔

○

اپنی ذہانت، محنت اور کارکردگی کی بدولت ناظم کو دہلی اور ممبئی میں بڑی کامیابیاں حاصل ہوئی تھیں۔ اس کے اندازے کے مطابق اس سلسلے کی ایک کڑی کے حیدرآباد سے بھی جڑے ہونے کے اندیشے نے آج اسے حیدرآباد تک پہنچا دیا تھا۔ یہ شہر، اس کے لیے نیا مگر پرکشش تھا۔ آندھرا پردیش پولس کے حیدرآباد ہڈ کوارٹر سے رابطہ قایم کرنے کے بعد اُس نے شروع کے دو روز سیر و تفریح کے لیے وقف کر دیے تھے۔ کسی نئے شہر میں جا کر کام کرنے کا اس کا یہ طریقہ پرانا تھا۔ اصل میں پورے شہر اور اس کی ہر سڑک اور خاص محلّوں سے واقف ہونا اس کا خاص مقصد تھا چنانچہ اس کام کے لیے اس نے ایک

ٹیکسی بک کی اور عام سیاحوں کے مانند شہر دیکھنے نکل پڑا تا کہ شہر کے محل وقوع سے بخوبی واقف ہو سکے۔ بیشتر معاملات میں وہ خود پر ہی زیادہ بھروسہ کرتا تھا چنانچہ کسی بھی نئے شہر میں جانے کے بعد وہ اپنے طور پر پورا شہر خود ہی دیکھنا زیادہ پسند کرتا تھا۔

○

فلیٹ کی آرائش کا کام مکمل ہو جانے کے بعد دینا نے بیٹی کو حیدر آباد گھمانے کا ارادہ کیا۔ وہ ٹیکسی اسٹینڈ کے آفس میں داخل ہوئی اور کل کے لیے ایک ٹیکسی بک کرالی۔ وہ واپسی کے لیے مڑی ہی تھی کہ اس کی نگاہ ایک لمبے چوڑے اور گورے چٹے شخص پر پڑی تو وہ ٹھٹک گئی۔ اسے دیکھ کر چند لمحوں کے لیے وہ شخص بھی رُکا تھا مگر پھر دینا باہر اور وہ شخص اندر چلا گیا۔ لاکھ کوششوں کے باوجود دینا یہ سمجھ سکنے سے قاصر تھی کہ آخر اس انجان شخص میں ایسا کیا تھا جسے دیکھ کر وہ یوں ٹھٹک گئی تھی۔ ذہن پر کافی دیر تک زور دینے کے باوجود وہ نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ اُس شخص کو اس نے اِس سے قبل کہاں اور کب دیکھا ہے۔ ''کہیں وہ اُن میں سے تو نہیں تھا...... ہوگا۔ بہت سے ایسے چہرے ہوتے ہیں جو بادی النظر میں شناسا معلوم ہوتے ہیں۔ کوئی ضروری تو نہیں کہ یہ میرا کوئی شناسا ہی ہو۔ اگر کوئی پرانا شناسا ہوتا تو اس سے بات کرنے کی کوشش ضرور کرتا۔ مگر وہ بھی تو اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا..... ہو گا۔'' یہ سوچ کر وہ آگے بڑھ گئی مگر اسے قرار نہ تھا۔

ہر چند کہ دینا اب اپنی بیٹی کے مستقبل کی طرف سے کافی حد تک مطمئن ہو چکی تھی مگر جو ہی سے دوری نے اس کی زندگی میں ایک عجیب سا خلا پیدا کر دیا تھا۔ وہ ہر چھٹی میں جو ہی کو گھر لا کر اپنے ساتھ ہی رکھتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ اچھی تربیت بھی بہت ضروری ہوتی ہے جو بچوں کو والدین، اپنے گھر اور معاشرے سے ہی مل سکتی ہے۔

امید کے مطابق دوسری صبح ٹیکسی والا ٹھیک سات بجے اس کے گھر پر حاضر ہو گیا

تھا۔ گھر سے نکلنے کے بعد وہ دونوں سب سے پہلے سالار جنگ میوزیم پہنچیں۔ وہ لوگ ابھی ٹھیک سے میوزیم دیکھ بھی نہیں پائی تھیں کہ دینا کی نظر اچانک اُس جوان پر پڑی جسے اس نے کل ٹیکسی اسٹینڈ کے دفتر میں دیکھا تھا۔ وہ ایک خوش شکل اور لمبا چوڑا جوان تھا۔ عمر تقریباً بتیس برس کے آس پاس رہی ہوگی۔ شکل وصورت سے ہی وہ کسی اچھے خاندان کا چراغ نظر آرہا تھا۔ وہ بھی مسلسل دینا اور جوہی کو دیکھے جارہا تھا۔ میوزیم کے اندر تو ان لوگوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی مگر باہر نکل کر جب جوہی نے دینا سے آئس کریم کھانے کی فرمائش کی تو اس نے جوہی کو سامنے والے آئس کریم پارلر میں جانے کی صلاح دیتے ہوئے کہا۔

''ابھی آئس کریم کھانے کا میرا دل نہیں چاہ رہا ہے۔ میں کچھ دیر یہیں باغیچے میں بیٹھنا چاہتی ہوں۔ تم آئس کریم کھا کر یہیں واپس آجانا پھر ہم لوگ کسی دوسرے مقام کی سیر کے لیے نکلیں گے۔''

''جی اچھا امی۔ آپ یہیں بنچ پر بیٹھ کر میرا انتظار کیجیے، میں سامنے والے پارلر سے آئس کریم کھا کر واپس آتی ہوں۔'' اور وہ دینا سے پیسے لے کر آئس کریم پارلر کی طرف چلی گئی۔

جوہی کو گئے ہوئے ابھی پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ دینا نے اسی شخص کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو وہ بنچ سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ دینا کے قریب پہنچ کر اس نے اسے نہایت شریفانہ انداز میں سلام کیا۔

''السلام علیکم محترمہ! اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو شاید آپ دینا...... دینا اکرام حسین ہیں اور میں محمد ناظم علی۔ تمہارے تایا حاجی عزیز الدین کا بیٹا ہوں۔'' اس نے اپنے ساتھ دینا کا بھی تعارف کرایا تو دینا کے دل و دماغ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ دینا کے چہرے پر متعدد قسم کے جذبات بیک وقت صاف نظر آرہے تھے۔ اس کے

چہرے پر خوشی تھی تو آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ وہ یہ سمجھنے سے قطعی قاصر تھی کہ اِن حالات میں اُسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ اپنا چہرہ رومال سے چھپا کر سسکنے لگی۔

''میں ناظم ہوں دینا۔ تم گزشتہ گیارہ برسوں سے آخر تھیں کہاں؟ تمہاری یاد میں عموں جان اور چچی جان کے آنسو اب تک تھمے نہیں ہیں۔ تمھاری اچانک گمشدگی کی تاب نہ لا کر دادا میاں صرف پندرہ دنوں بعد ہی راہی عدم ہو گئے۔ یقین کرو کہ ہمارے خاندان کے ہر فرد کی آنکھیں، تمہارے آنے کی راہ دیکھتے دیکھتے پتھرا گئی ہیں۔ آخر تم تھیں کہاں اور یہاں تک کیسے پہنچیں؟ مجھے بتاؤ تا کہ میں تمھارے لیے کچھ مثبت کر سکوں۔''

اور وہ دینا کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ عرصہ میں ہی دینا نے خود پر قابو پا لیا تھا۔ اس نے اپنے آنسو پوچھنے کے بعد ناظم کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ دینا کے پاس بیٹھ گیا تو اُس نے ٹھہر ٹھہر کر اپنی تمام آپ بیتی ناظم کو سنا دی۔ ناظم خاموشی سے دینا کی باتیں سن رہا تھا۔ اِس درمیان کبھی اس کا چہرہ غصے سے تمتما جاتا تو کبھی آنکھیں بھر آتیں۔ دینا کی آپ بیتی ختم ہوتے ہوتے جوہی بھی آئس کریم پارلر سے نکل کر اس کے پاس آ گئی تھی۔ اپنی ماں کے ساتھ ایک اجنبی شخص کو دیکھ کر اس نے ماں کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے ناظم سے کہا۔

''یہ میری بیٹی جوہی ہے اور یہ محمد ناظم علی۔''

''کون محمد ناظم علی؟ میں کچھ سمجھی نہیں امی۔'' جوہی مسلسل ناظم کو کینہ توز نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔

''تمہاری ماں ذہنی طور پر بہت پریشان ہیں جوہی بیٹے، اس لیے میں اپنا تعارف خود ہی کراتا ہوں..... میرا نام تو دینا نے آپ کو بتا ہی دیا ہے۔ دینا میرے چچا اکرام حسین کی بیٹی اور میری بیوی ہے۔ ہمارے نکاح کے چند دنوں بعد ہی اسکول سے واپسی کے دوران یہ لاپتہ ہو گئیں تھیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آج یہ صحیح وسلامت مجھے مل

گئیں۔ میں نے کل ٹیکسی اسٹینڈ کے دفتر میں دینا کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا اور وہیں سے تم لوگوں کا آج کا پورا پروگرام نوٹ کیا اور تم لوگوں سے قبل یہاں پہنچ گیا۔''

''لیکن آپ یوں اچانک اس دور دراز شہر میں کیسے......؟'' دینا نے سوال کیا تو ناظم نے اسے اپنا عہدہ اور اس شہر میں اپنی موجودگی کا مقصد بتایا۔ اس کے بعد جوہی نے اس سے اصرار کیا کہ وہ ان سے ملنے روز، ان کے گھر آیا کریں۔

''ہاں، میں وعدہ کرتا ہوں اور آج شام کو بھی ضرور آؤنگا۔'' دینا خاموشی سے دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ عجیب کشمکش کے عالم میں تھی۔ اسے اب کیا کرنا چاہیے، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ناظم انھیں 'خدا حافظ' کہہ کر چل دیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد دینا نے اپنا آج کا پورا پروگرام رد کر دیا اور ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ وہ انھیں سیدھے گھر لے چلے۔ گھر پہنچ کر وہ بستر پر دراز ہوگئی۔ کافی غور وخوض کے بعد بھی دینا یہ سوچ سکنے سے کلیتاً قاصر تھی کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ حقیقتاً اسے آج ایک ایسی خوشی ملی تھی جس کا تصور ان حالات میں کسی کے لیے بھی قرین قیاس نہیں تھا کیوں کہ اس کے ماضی نے اسے ذلتوں کے جس دلدل میں پھنسا رکھا تھا، اس سے باہر نکلنے کا کوئی حل اُس کے پاس نہیں تھا۔ اس کا ذہن عجیب وغریب طوفانی کیفیت کا محور بنا ہوا تھا۔ اپنا گھر، اپنا خاندان، اپنے رشتے دار، اپنی گمنام زندگی کے گیارہ برس، اپنی بدنامیاں، اپنی خوشیاں اور اپنے بیکراں غموں کے جس سمندر میں وہ اِس وقت غوطہ ظن تھی، اس کرب کا اندازہ شاید اس کے سوا اور کسی کو نہیں ہو سکتا تھا۔ نشیب وفراز والی گھاٹیاں، بے آب وگیاہ ویرانے، ننگی اور مخروطی چٹانوں اور زود فنا گلپوش وادیوں سے گزرتے ہوئے کب شام ہوگئی، اسے اس کا پتہ ہی نہ چل سکا۔ جب جوہی نے اسے چونکا کر ناظم کے آنے کی اطلاع دی تب کہیں اسے اپنے وجود کا احساس ہو سکا تھا۔

''کیا کہا؟ وہ آگئے۔ اچھا تم انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ، میں ابھی آتی

ہوں۔'' یہ کلمات بھی اس کی زبان سے غیرارادی طور پر ہی نکلے تھے۔اور جوہی یہ کہتی ہوئی وہاں سے چلی گئی کہ'' آپ ڈرائنگ روم میں چلیے، میں چائے لے کر آرہی ہوں''۔

ڈرائنگ روم میں آکر دینا خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئی۔ وہ ناظم سے کیا کہے، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔آخرکار ناظم نے خاموشی توڑتے ہوئے اسے متوجہ کیا۔

''جانتی ہو دینا، تمھارے اچانک گم ہوجانے کے پانچ چھ برس کے بعد جب ہر کوئی تمہاری طرف سے ناامید ہوگیا تو اماں مجھ پر دوبارہ شادی کرنے کے لیے دباوڈالنے لگیں۔''

''تو کیا آپ نے اب تک شادی نہیں کی؟''اس نے بیچ میں ہی ناظم کی بات کاٹتے ہوئے سوال کیا۔

''پولیس والا ہوں بھئی، بغیر مستحکم ثبوت کے کسی بات پر یقین نہیں کرتا پھر بھلا لوگوں کے کہنے پر میں یہ کیسے تسلیم کر لیتا کہ میری بیوی اب نہیں ملے گی۔''اس نے کہا تو دینا زیرلب مسکرادی۔ناظم کی قربت اسے بھلی محسوس ہورہی تھی۔تھوڑے عرصے کے بعد جوہی چاے لے کر آئی تو دینا نے اسے بھی وہیں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا مگر کچھ ضروری کام کا حوالہ دے کر وہ ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئی۔چاے کے درمیان ناظم نے دینا سے مخاطب ہوکر کہا۔

''دینا، اگر تمھیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں تم سے تمھاری گزشتہ زندگی کے تعلق سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں۔ہاں ضرور۔'' دینا نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''یقین کرو دینا، میرے کسی سوال کا مقصد تمھارا دل دکھانا ہرگز نہیں ہے بلکہ میں تم سے حاصل شدہ معلومات کے ذریعے ان درندوں تک پہنچنا چاہتا ہوں جنھوں نے

ہزاروں معصوم بچیوں کی زندگیاں تباہ کی ہیں، سیکڑوں گھروں کو آنسوؤں کے سیلاب میں غرق کیا ہے۔ میں ان وحشی درندوں کی جڑیں تک کھود ڈالنا چاہتا ہوں۔ اگر تم مجھے ان لوگوں کی سکونت اور نام پتے، اپنی مرضی سے بتا دو تو میں تمہارا شکر گزار ہوؤں گا اور اگر تم نہ بتانا چاہو تو اصرار نہیں کروں گا۔'' اتنا کہہ کر وہ دینا کو پر امید نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''ناظم، مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تمھارے توسط سے میں سماج اور ملک کی ایک بڑی خدمت کرنے جا رہی ہوں۔ اس طرح میں ایک ہی جھٹکے میں سماج کے ان دشمنوں سے بھی بدلہ لے لوں گی، جنھوں نے میری زندگی برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔'' اس کے بعد دینا نے ناظم کو ان تمام لوگوں کے نام اور پتے لکھوا دیے جو اس کے ذہن میں محفوظ تھے۔ تمام معلومات حاصل کر لینے کے بعد ناظم نے بات کا رخ بدلتے ہوے کہا۔

''جوہی کی بڑے دنوں کی چھٹیاں کب سے شروع ہو رہی ہیں؟''

''اسی ماہ کی چودہ تاریخ سے اور اس کا اسکول دوبارہ سات جنوری کو کھلے گا۔ کیا کوئی خاص بات ہے؟'' دینا نے سوال کیا۔

''ہاں۔ بہت خاص۔ میں تمھیں، جوہی کے ہمراہ وطن لے چلنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ گھر والے تم لوگوں کو دیکھیں گے تو بہت خوش ہوں گے۔'' اس نے اپنی منشا ظاہر کیا تو دینا نے سوال کیا۔

''مگر جوہی......! کیا وہ لوگ مجھے اور جوہی کو......؟''

''مجھے یقین ہے کہ سبھی لوگ تم دونوں کی اچانک آمد پر بہت مسرور ہوں گے۔ بس تم گھر چلنے کی تیاری شروع کر دو۔ میں ٹکٹ ریزرو کروا لیتا ہوں۔'' اور کل پھر آنے کا وعدہ کرنے کے بعد وہ چلا گیا۔

دینا کو ناظم پر تو بھروسہ تھا مگر وہ اپنے ماضی اور جوہی کی طرف سے بہت فکر مند

تھی۔اس کا دل تو گھر کے ہر فرد سے ملنے کو بہت بے چین تھا مگر ایک انجانا سا خوف اس کے گھر جانے میں مانع ہورہا تھا۔آخر کار ہمت کر کے وہ راضی ہوگئی۔

○

جب گاڑی اسٹیشن پر رکی تو دینا کا دل کسی انجانے خوف کے سبب تیزی سے دھڑکنے لگا۔ناظم اور دینا نے سامان سمیٹا اور وہ لوگ پلیٹ فارم پر اتر گئے۔دینا اور جوہی جب ناظم کے ہمراہ گھر پہنچے تو اس وقت شام کے کوئی چار بج رہے تھے۔پورا گھر نہایت خوبصورتی کے ساتھ آراستہ کیا گیا تھا۔گھر کے صدر دروازے پر جلی حروف میں 'خوش آمدید دینا اور جوہی' لکھا ہوا تھا۔دینا کبھی صدر دروازے پر لکھی ہوئی تحریر کو دیکھتی تو کبھی ناظم کو۔ناظم نے کال بل کا بٹن دبایا تو دروازہ فوراً کھول دیا گیا۔ان دونوں کے استقبال کے لیے آج سارا خاندان یکجا تھا۔ان میں بیشتر کے ہاتھوں میں گلدستے اور پھولوں کے ہار تھے۔اس نے جیسے ہی گھر میں قدم رکھا،سب سے پہلے دینا کی ماں،اس سے لپٹ کر زارزار رونے لگیں۔خاندان کے تمام لوگوں کے چہرے خوشی سے کھلے ہوئے تھے مگر بیشتر کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ہر کسی کے چہرے مخلوط جذبات کی نمائندگی کر رہے تھے۔

تین چار دنوں تک دینا اور جوہی، گھر والوں میں گھرے رہے۔ ہر کوئی زیادہ سے زیادہ،ان لوگوں کی دلجوئی میں لگا رہتا تھا۔خاندان کا ہر فرد اپنی تمام ممتا اور پیار دینا اور اس کی بیٹی پر نچھاور کیے دے رہا تھا۔تین چار دنوں کے عرصے میں ہی دینا کے دل پر لگے تمام کاری زخم کچھ اس طرح بھر چلے تھے کہ وہ اپنی پرانی زندگی یکسر فراموش کر گئی تھی، پھر بھی دینا نے محسوس کیا کہ جیسے اس کی ساس یعنی ناظم کی والدہ ان دونوں سے مل کر خوش ہونا تو دور، کچھ کھنچی کھنچی سی رہتی تھیں۔ ہر چند کہ اس سلسلے میں اس نے گھر کے کسی فرد سے کچھ بھی نہیں کہا تھا پھر بھی دینا سے اس کی ساس کا کبیدہ خاطر ہونا کسی سے چھپا بھی نہیں تھا۔آخر کار ایک روز ناظم نے سب کی موجودگی میں اپنی والدہ کو ٹوک ہی دیا۔

''امّاں، مَیں نے محسوس کیا ہے کہ آپ دینا اور جوہی کی گھر واپسی سے خوش نہیں ہیں۔ان دونوں کو کتنا دکھ ہوتا ہوگا اماں......آخر آپ کا برتاوان دونوں کے ساتھ ویسا ہی کیوں نہیں ہے جیسا اوروں کا ہے؟'' ناظم کے اس سوال پر پہلے تو وہ چند لمحہ خاموش رہیں پھر آہستہ سے کہا۔

''ناظم بیٹا، دینا تمھاری بیوی اور میری بہو ہے۔لوگ اسے اس گھر کی بیٹی کی حیثیت سے کم، میری بہو کی حیثیت سے زیادہ جانتے ہیں۔دینا کے تعلق سے ہر کسی کے طعنے تشنے صرف مجھے برداشت کرنے ہوں گے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ دینا کے ہمراہ جوہی بھی......لوگ کیا سوچیں گے؟'' ناظم نے محسوس کیا کہ وہ زیادہ فکر مند نظر آرہی ہیں تو اس نے کہا۔

''اماں.....'لوگ کیا کہیں گے'؟ایسا صرف لوگ سوچتے ہیں جو بلا شبہ ہماری خام خیالی ہے۔کسی کے پاس اتنی فرصت اور دوسروں میں دلچسپی نہیں ہوتی ہے کہ وہ اپنا سارا کام کاج چھوڑ کر دوسروں کے بارے میں سوچے۔حقیقت تو یہ ہے کہ ہر کوئی اپنے عیب کی پردہ پوشی اور خود کو سماج میں بہتر طریقے سے پیش کرنے کی فکر میں رہتا ہے نہ کہ دوسروں کے بارے میں سوچتا ہے۔ایک بات سمجھ لیجیے کہ اگر دینا میری بیوی نہ ہوتی اور میرے عموں جان کی بیٹی بھی نہ ہوتی یعنی میرے لیے قطعی غیر ہوتی تب بھی میں اسی کا ساتھ دیتا کیونکہ وہ مظلوم ہے۔حالات کے پیش نظر تو گھبرا کر اسے خودکشی کر لینی چاہیے تھی مگر اس کی ہمت اور بہادری تو دیکھیے ۔دینا ہی نہیں، میرا خیال ہے کہ ہر عورت بہت بہادر ہوتی ہے،شاید مردوں سے بھی زیادہ۔افسوس کہ مردوں نے ہمیشہ اپنی بے وقعت جسمانی طاقت کے غرور میں عورتوں کو کبھی اس کا جائز حق نہیں دیا۔کتنے افسوس کا مقام ہے کہ قدرت کے اس لاثانی عطیہ کو ہم مردوں نے اب تک نہیں پہچانا۔آپ کو تو عورتوں کی بہادری اور ہمت سے نابلد نہیں ہونا چاہیے اماں۔حقیقت تو یہ ہے کہ عورتیں اس دنیا کو

خداوند کریم کا بیش بہا تحفہ ہیں۔ آپ تو دینا کی بڑی ماں اور اس کی ساس ہونے کے ساتھ ایک عورت بھی ہیں۔ دینا کی اہمیت آپ کے نزدیک دوسروں سے زیادہ ہونی چاہیے۔ یہ تو فطری ہے اماں۔ آج اسے سب سے زیادہ میرے اور آپ کے پیار اور سہارے کی ضرورت ہے۔ دینا کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے وہ محض ایک حادثہ تھا جو کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ خدانخواستہ آپ کی بیٹی کے ساتھ بھی۔'' اتنا کہتے کہتے ناظم کی آواز بھرّا گئی تو اُس کی ماں نے آہستہ سے کہا۔

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا۔ جنگلوں کی نابودی کے لیے صرف آہنی تبر کو ذمہ دار کیوں ٹھہرایا جائے، تبر کے ساتھ لکڑی کا دستہ بھی تو جنگلوں کی بربادی کے لیے کچھ کم ذمہ دار نہیں۔ عورتوں کی بدحالی اور کسمپرسی میں اکثر عورتیں بھی معاون ہوتی ہیں......! دینا بیٹی، کوئی تیرا ساتھ دے نہ دے، میں ہمیشہ تیرا ساتھ دوں گی۔'' یہ سن کر دینا مسکرا دی۔

''اور جوہی تو میری بیٹی ہے۔ اسے مَیں، دینا کی خواہش کے مطابق ایک بڑی ڈاکٹر بناؤں گا۔'' یہ سن کر جوہی اتنی خوش ہوئی کہ دوڑ کر ناظم سے لپٹ گئی اور وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

تین گھنٹے

شمشاد کی بیوی کو آپریشن روم میں گیے ہوے بمشکل تمام ابھی پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے جبکہ ڈاکٹر کے مطابق یہ آپریشن تین گھنٹے تک چلنا تھا۔اسی بیچ آپریشن والے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک ڈاکٹر نے اس کی بیوی کا نام لے کر پکارا تو شمشاد سرعت کے ساتھ اس کی طرف لپکا۔

''یہ دوائیں اور انجکشن فوراً لاؤ۔'' اس نے شمشاد کی طرف ایک پرچہ بڑھاتے ہوے کہا۔شمشاد، ایک لمحہ کی تاخیر کیے بغیر دوڑ پڑا اور تقریباً پندرہ منٹ کے اندر ہی ساری دوائیں اور انجکشن لے کر حاضر ہو گیا مگر جب وہ لوٹا تو آپریشن والے کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل پایا تو وہیں پڑی ہوئی ایک بنچ پر بیٹھ گیا مگر اُسے چین نہ پڑا۔ وہ پھر اُٹھ کر دروازے تک گیا۔ دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔اس نے چابی والے سوراخ سے جھانک کر اندر دیکھا بھی مگر اسے چھ سات گز کے فاصلے پر ایک دوسرے بند دروازے کے علاوہ کچھ بھی نظر نہ آیا۔و. بے چینی سے ٹہلتے ہوے بڑبڑاتا جا رہا تھا۔'' آپریشن شروع ہوے تقریباً ایک گھنٹہ گزر چکا ہے۔ڈاکٹر نے دوائیں اور انجکشن فوراً لانے کو کہا تھا مگر دروازہ ہی بند ہے۔میرا کیا قصور ہے، میں تو فوراً واپس لوٹا ہوں۔''

اتنے میں دروازہ پھر کھلا۔اس مرتبہ ایک نرس برآمد ہوئی جس سے شمشاد نے اپنی بیوی کے متعلق دریافت کیا تو اُس نے کچھ بتایا نہیں بلکہ سوال کیا۔

''کیا پیشنٹ کے ساتھ تم ہو؟'' سوال سُریلی مگر کرخت آواز میں کیا گیا تھا۔

''جی ہاں۔''

''دوائیں اور انجکشن لائے ہو؟'' اس مرتبہ لہجہ قدرے نرم تھا۔

''جی، یہ ہیں۔ میری وائف کیسی ہے؟'' دواؤں کا پیکٹ نرس کی طرف بڑھا کر وہ اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا مگر نرس نہ تو رکی، نہ ہی اس کے سوال کا جواب دیا۔ وہ پھر اندر چلی گئی اور دروازہ پہلے کی طرح خود بخود چپک گیا۔ 'شاید اسپرنگ لگی ہے دروازے میں۔'

''یا اللہ، رحم کرنا' اس غریب پر۔ نہ جانے کس عالم میں ہو؟ وقت ہے کہ گزر ہی نہیں رہا ہے۔ لگتا ہے کہ جیسے گھڑی کی سوئی جام ہوگئی ہے۔ کافی عرصہ بعد بھی جب گھڑی کی طرف دیکھتا ہوں تو کمبخت سوئی، دس بارہ منٹ ہی آگے کھسکی دکھائی دیتی ہے۔ تین گھنٹہ تو جیسے پہاڑ ہوگیا ہے۔'' ابھی صرف پونے آٹھ بجے تھے۔ وہ پھر بے چین سا وہیں ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے تھک کر آخر کار پھر اسی بنچ کے ایک کونے پر بیٹھ رہا۔ تمام رات کی جگائی، تکان اور ذہن پر اتنا بڑا بوجھ۔ پتہ نہیں کب اس پر ہلکی سی غنودگی طاری ہوگئی۔ جب اس کی گردن جھٹکے کے ساتھ ایک طرف لڑھکی، تب اس کی آنکھ کھلی تو وہ ہڑبڑا کر سیدھا بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں غیر ارادی طور پر آپریشن والے کمرے کے دروازے کی طرف اٹھ گئیں جو پہلے کی ہی طرح بند تھا۔ اسے لگا کہ وہ شاید کافی دیر تک سو گیا ہو۔ اس نے پھر گھڑی کی طرف دیکھا۔ آٹھ بج کر پانچ منٹ۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ آپریشن میں تین گھنٹے لگیں گے۔ ابھی صرف ایک گھنٹہ گزرا تھا۔ وہ پھر اونگھنے لگا مگر اس مرتبہ وہ اپنے حواس پر نیند کو غالب نہیں آنے دینا چاہتا تھا چنانچہ پھر اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس نے وہیں ہال کے کونے میں لگے ایک بیسن پر اچھی طرح منھ دھو کر نیند بھگایا اور پورے ہال میں ٹہل ٹہل کر دیواروں پر آویزاں ہدایات بڑھنے لگا۔ کینسر، ٹی. بی. اور ایڈس سے بچاو کے تمام نسخے اس نے پڑھ ڈالے اور تھک ہار کر پھر واپس بنچ پر آبیٹھا۔ اب ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ یعنی اس کی بیوی صرف ڈیڑھ گھنٹہ میں باہر آجائے گی۔ وہ یہی سب سوچ رہا تھا کہ آپریشن روم

کا دروازہ پھر کُھلا تو وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دستور کے مطابق ڈاکٹر نے اُس کی بیوی کا نام لے کر پکارا تو وہ آگے بڑھا۔ ڈاکٹر نے اُسے پھر ایک پرچہ پکڑاتے ہوئے ہدایت دی۔

''پیشنٹ کو اچانک خون کی ضرورت آن پڑی ہے اور اِس گروپ کا خون ہمارے بلڈ بینک میں موجود نہیں ہے۔ تم فوراً آئی.ایم.اے. چلے جاؤ یا جہاں بھی ملے، خون لے آؤ۔ جتنی جلدی ممکن ہو کیوں کہ زیادہ دیر تمہاری بیوی کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔'' اس نے کہا اور فوراً دروازے کی طرف مُڑ گیا جبکہ شمشاد اپنی بیوی کی خیریت جاننے کے لیے بے چین تھا۔ وہ پھر نکل پڑا اور طرح طرح کے خیالات کے ساتھ ہسپتال کے گیٹ پر پہنچا۔ اتفاق سے ایک خالی رکشہ وہیں پر کھڑا مل گیا۔ اس نے سوال کیا تو رکشہ والا آئی.ایم.اے. چلنے کو تیار ہو گیا۔

''بہت تیز چلنا بھائی۔ میری بیوی کا آپریشن چل رہا ہے۔ اُسے اچانک خون کی ضرورت آن پڑی ہے۔ ذرا تیز چلو، مہربانی ہو گی۔'' اور رکشہ والے نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے رکشہ کی رفتار بڑھا دی۔ خدا کا شکر ہے کہ امید کے خلاف منزلِ مقصود جلد ہی آ گئی۔ اس نے رکشہ کا کرایہ ادا کیا اور سامنے والی بِلڈنگ کے گیٹ میں داخل ہو گیا۔ سامنے ہی ایک لمبا سا کاؤنٹر بنا تھا۔ وہاں موجود ایک آدمی کی طرف اس نے ڈاکٹر کا دیا ہوا پرچہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مجھے اس گروپ کا خون چاہیے۔ کتنے پیسے دینے ہوں گے؟'' کاؤنٹر کلرک نے پہلے تو اسے گھور کر دیکھا پھر کہا۔

''خون بکتا نہیں۔ خون کے عوض ہی ملتا ہے۔ یا تم خود اپنا خون دو یا کسی ڈونر کو راضی کرو۔'' اس نے شمشاد کو سمجھایا۔

''جی ہاں۔ آپ میرا خون لے لیجیے۔ اس عالم میں مَیں ڈونر کہاں سے لاؤں گا؟ ذرا جلدی کیجیے گا صاحب، میری بیوی......!'' اس نے غیر ارادی طور پر قمیص کے کف کا

بٹن بھی کھول دیا۔ کاؤنٹر پر بیٹھے آدمی نے اسے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔

تقریباً پندرہ منٹ کے بعد اس کے ہاتھ میں وہ بیش قیمتی خون تھا جس سے اس کی بیوی کو نئی زندگی ملنے والی تھی۔ خون کی بوتل کو اُس نے اپنے نوزائیدہ اور کمزور بچے کے مانند دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر سینے سے چپکا رکھا تھا۔ اب اس کی منزل وہ ہسپتال تھی جہاں اس کی بیوی کا آپریشن چل رہا تھا۔ جب وہ باہر نکلا تو سڑک پر بھیڑ پہلے سے زیادہ بڑھ چکی تھی۔ بڑی مشکل سے اُسے ایک خالی رکشہ دکھائی دیا تو وہ اس پر بیٹھ گیا اور اسے ہسپتال کا پتہ بتایا۔ ابھی رکشہ بمشکل تمام دو فرلانگ ہی چلا ہوگا کہ چوراہے پر لگا ہوا جام دیکھ کر رکشہ والے نے رکشہ روک دیا۔ ایک بڑی سی اسکول بس نے پورا ٹرافک جام کر رکھا تھا۔ شمشاد ایکدم سے گھبرا گیا۔ اسے لگا کہ یہ جام گھنٹوں کا وقت لے سکتا ہے۔ وہ فوراً رکشہ سے اُترا اور خون کی بوتل سینے سے چپکائے ہوئے ہسپتال کی طرف پیدل ہی دوڑ پڑا۔ ہسپتال پہنچتے پہنچتے وہ تھک کر چور ہو چکا تھا۔

خون کی بوتل پر اب بھی شمشاد کی گرفت پہلے جیسی ہی مضبوط تھی۔ راستے میں اُسے کئی جگہ دھکّا بھی لگا مگر اس نے خون کی بوتل کو ٹس سے مس نہیں ہونے دیا۔ وہ جلدی جلدی ہسپتال کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا آپریشن والے کمرے کے دروازے تک جا پہنچا۔ دروازہ پہلے کی طرح بدستور بند تھا۔ مگر اب وہ پہلے کی طرح انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے دروازے کو پیر سے ڈھکیلا تو دروازہ ذرا سا کھلا مگر پھر چپک گیا۔ ”لگتا ہے بند نہیں ہے، اسپرنگ لگی ہے۔“ اس نے دروازے کو دوبارہ پیر سے ہی دھکا دیا اور جب دروازہ تھوڑا سا کھلا تو وہ اُس میں گھس گیا۔ ابھی اُس کا آدھا دھڑ ہی اندر گیا تھا کہ سامنے سے ایک نرس آتی ہوئی دکھائی دی، جو اس کے اس طرح اندر گھسنے کی کوشش پر خاصی ناراض تھی۔ اس نے شمشاد کو غصے سے گھور کر دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ”او.ٹی. میں کہاں گھسے آرہے ہو؟ چلو باہر نکلو۔“

''اندر میری بیوی کا آپریشن چل رہا ہے۔ اسی کے لیے خون لینے گیا تھا۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ وہ دروازے کو اب بھی ایک پیر سے روکے کھڑا تھا۔ نرس نے دوبارہ سختی سے کہا۔

''پہلے باہر نکلو پھر بات کرنا۔'' وہ باہر نکلنے کے لیے جیسے ہی مڑا، دروازے کا وہ پلّا، جسے اس نے اپنے پیر سے روک رکھا تھا، ایک جھٹکے کے ساتھ اُس سے ٹکرا گیا اور ''چھَن'' کی آواز کے ساتھ خون کی بوتل چور ہوگئی۔ اس نے پہلے زمین پر بکھرے ہوے خون کو دیکھا پھر دیوار پر آویزاں گھڑی کی طرف۔ تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ اُس کا سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔

●

خنجر کا فرض

ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں تقریباً ساٹھ آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ غالباً کسی نشست کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اتنے زیادہ لوگوں کی موجودگی کے باوجود کمرے میں سناٹا تھا۔ صدر جلسہ ہر شخص کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ غالباً کسی اہم مسئلے پر اراکین کی صلاح کا منتظر تھا مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی کی بھی عقل کام نہیں کر رہی ہے۔ کچھ اور وقفہ گزر جانے کے بعد گھور پڑے نام کے ایک شخص نے کچھ کہنے کے لیے گلا صاف کیا تو صدر سمیت تمام اراکین مجلس اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس نے صدر کو مخاطب کرنے کے بعد کہنا شروع کیا۔

''صدر محترم، بہت سوچ بیچار کے بعد میرے من میں جو بات آئی ہے وہ یہ ہے کہ آج کل کپڑوں اور صورت شکل یا بات چیت سے کسی آدمی کے دھرم کا اندازہ کر سکنا تقریباً ناممکنات میں سے ہے۔ نوے فی صد لوگ پینٹ اور شرٹ میں نظر آتے ہیں۔ عام طور پر لوگ یا تو ڈاڑھی رکھتے ہی نہیں یا رکھتے بھی ہیں تو فیشن والی۔ خاص بھیس میں کم ہی لوگ دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے لوگ زیادہ تر اپنے محلوں تک ہی محدود رہتے ہیں۔ ان کے محلوں میں گھس کر ان پر حملہ کرنے کا نتیجہ تو آپ سب دیکھ ہی چکے ہیں۔ اتنا بڑا رِسک لینا تو......!''

اس کی بات ختم ہونے سے قبل ہی صدر نے جھنجھلا کر کہا۔

''مِسٹر گھور پڑے، آپ یہ کوئی نئی بات نہیں بتا رہے ہیں، صرف ہمارا وقت برباد کر رہے ہیں۔ ہمیں آپ لوگوں سے بہتر صلاح کی توقع ہے۔ صلاح ایسی کہ جو

تیر بہدف ہوااور آپ ہیں کہ......!'' اس طرح کی پھٹکار پر گھو پڑے تھوڑا شرمندہ ضرور ہوا تھا مگر خاموش نہ بیٹھا اور دوبارہ پھر بول پڑا۔

''شری مان جی! میں وہی بتانے جا رہا ہوں۔ میں ان لوگوں کے ساتھ لمبے سمے تک رہا ہوں اس لیے ان لوگوں سے خوب پریچت ہوں۔ ان لوگوں میں چاہے کوئی شخص سلام بھلے ہی نہ کرے مگر ان کے مذہبی قانون کے مطابق سلام کا جواب دینا ان پر فرض ہوتا ہے۔ ہم ان لوگوں کی اسی کمزوری کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے عام لوگوں کے بیچ سے ان لوگوں کو آسانی سے پہچان کر ان کا کام کر سکتے ہیں۔'' اس نے فخریہ کہا تو صدر نے اپنے دیدے الوؤں کے مانند نچاتے ہوئے کہا۔

''شاباش گھور پڑے، شاباش۔ آپ کی اسکیم میری سمجھ میں تو پوری طرح سے آ گئی ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ قاعدے سے اپنی اِسکیم کی وضاحت کریں تا کہ یہاں بیٹھے دیگر علاقوں کے ذمہ دار لوگ بآسانی آپ کا پلان سمجھ لیں اور اپنے ذہنوں میں پیدا شبہات بھی آپ کے توسط سے دور کرلیں۔'' صدر کی آنکھوں سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے عنقریب اسے اس کی منزل آسانی سے مل جائے گی۔

''ہمیں اپنے کاریہ کرتاؤں کو کیول دو دِنوں تک ہی ٹریننگ دینا ہوگی۔ ہمیں کرنا یہ ہے کہ اپنے علاقے سے گذر رہے جس آدمی پر شنکا ہو، ہمارا بہادر کاریہ کرتا اس کے نِکٹ جائے اور بڑی اپنائیت سے اس شخص کو اپنی طرف آکرشِت کرتے ہوئے مسکرا کر دبی آواز میں 'سلاں والے کُم' کہے۔ یدی وہ آدمی ہمارے کام کا ہوگا تو ایک پَل کی دیری کیے بِنا 'والے کم سلام' ضرور کہے گا اور ہمارا کاریہ کرتا پلک جھپکتے اس کا کام تمام کر کے وہاں سے نکل لے گا۔'' اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

گھور پڑے کے اس بھاشن کے بعد پورا ہال تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونج اٹھا۔ صدر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے گلے لگا لیا۔ وہاں موجود ہر محلے کے ذمہ داروں کی

آنکھوں میں کامیابی کی خاص چمک صاف نظر آرہی تھی۔ صدر تو اتنا خوش نظر آرہا تھا کہ اس کے منہ سے غیر ارادی طور پر بس یہی نکلا کہ ''واہ، کیا ٹریننگ ہوگی۔ ساما لے کم...... آلے کم، اور کام ہو جائے گا...... تمام علاقائی ذمہ داروں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے محلے کے تمام بہادروں کی ٹریننگ آج سے ہی شروع کروا دیں۔ 'ساما لے کم...... آلے کم'۔ واہ گھور پڑے واہ۔ اب تو ہمارے بہادروں کی تعداد اتنی اَدھک ہو چکی ہے کہ وہ سب آپس میں ایک دوسرے کو پہچانتے تک نہیں۔ گُپت بھاشا میں پریچے کرانا پڑتا ہے۔ واستو میں ہمیں لوگ دھرم اور جاتی کے رَکچھک ہیں۔ اب تو ستا کا بھوگ ہم لوگوں کا بھاگیہ بن کر رہے گا......!''

○

شہر میں اچانک فرقہ وارانہ فساد کیوں پھیلا، اس کا اندازہ انتظامیہ کو بھی نہیں ہو سکا تھا۔ تمام بڑے افسران جلد از جلد حالات پر قابو پا لینے کی فکر میں تھے۔ پولس اور سرکار کی مستعدی کی وجہ سے فسادیوں کو زیادہ کچھ کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا مگر چُھرے بازی کی وارداتیں تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ قابلِ غور یہ تھا کہ چاقو بازی میں زیادہ تر ایک ہی فرقے کے لوگ ہلاک کیے جا رہے تھے۔

گھور پڑے نے اپنے خنجر کی دھار پر آخری امتحانی نظر ڈالی۔ اسے پورے احتیاط سے اپنی کمر میں کھونسا اور ایک بس کے آخری اسٹاپ تک کا ٹکٹ لے کر اس میں سوار ہو گیا۔ بس کو صرف اُنھیں علاقوں سے ہو کر گزرنا تھا جن جن جگہوں پر کرفیو نہیں تھا۔ بس میں روز کے مقابلے بھیڑ بہت کم تھی۔ بمشکل تمام ۱۵ یا ۲۰/ افراد رہے ہوں گے۔ بس، گھور پڑے کے علاقے سے کافی دور نکل چکی تھی۔ اس کی فرقہ شناس نگاہیں ایک ایک مسافر کا جائزہ بڑے غور سے لے رہی تھیں جبکہ بس پوری رفتار سے فراٹے بھرتی ہوئی اپنی منزل کی طرف رواں تھی کہ اچانک اُسے مخاطب کرتے ہوئی پیچھے سے ایک ہلکی سی آواز

اُس کے کونوں سے ٹکرائی ''......ساما لے کم، بھائی جان......'' اور گھور پڑے کے منہ سے بھی غیر ارادی طور پر ''والے کم سلام'' نکل گیا۔ وہ جتنی دیر میں سنبھلا، پیچھے کی سیٹ سے ایک بڑا سا خنجر ہوا میں لہرایا اور گھور پڑے کے منہ سے بمشکل تمام گھٹی گھٹی سی آواز میں صرف اتنا ہی نکل سکا۔

''......ارررر ے......رے......رے......مم......میں ہن......ہند......!'' اور پیچھے سے اٹھا خنجر چشم زدن میں اپنے فرض کی ادائیگی سے سبک دوش ہو گیا۔ گھور پڑے اور اس کے اردگرد بیٹھے مسافروں کے ساتھ بس کے بریک کی بھی کریہہ سی چیخ، بس کی محدود فضا میں گونج اٹھی۔ جتنی دیر میں کوئی کچھ سمجھ پاتا، حملہ آور بس سے اُتر کر مسافروں کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

●

معزز لٹیرے

جب شاہین منہ ہاتھ دھو کر لوٹی تو قاسم کو ناشتہ کی میز پر خود کا منتظر پایا۔ ناشتہ کے درمیان تقریباً خاموشی رہی۔ ناشتہ کے بعد شاہین نے آہستہ سے پوچھا۔

''کہاں چلیے گا؟''

''ظاہر ہے، کسی اسپتال میں۔'' قاسم نے چائے کا ایک بڑا سا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔

''کیا......، اسپتال؟ آپ دیکھ رہے ہیں مجھے کتنا چکر آ رہا ہے اور پھر اسپتال کی بھیڑ بھاڑ اور طویل انتظار۔ نانا، میری طبیعت تو اسپتال کے نام سے ہی بگڑنے لگتی ہے۔ آج کل تو سارے اسپتالوں کی حالت غیر ہے۔ کسی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ بہتر ہوگا کہ مجھے کسی نَرسِنگ ہوم میں لے چلیے۔'' شاہین نے اپنے چِک اَپ کے لیے کسی سرکاری اسپتال میں جانے سے صاف انکار کر دیا۔

''ٹھیک ہے، جیسی تمھاری مرضی۔'' قاسم نے کہا اور چائے کی پیالی میز پر رکھ کر اٹھ گیا۔ شاہین بھی اس کے ساتھ ہو لی۔ دفتر پہنچنے میں دیر نہ ہو، اس خیال کے مدنظر قاسم فوراً شاہین کے مجوزہ نرسنگ ہوم کے لیے نکل پڑا۔ شاہین کا خیال تھا کہ یہ نرسنگ ہوم بہتر ہے۔ گذشتہ برس اس کی ایک رشتہ دار کو یہیں پر ڈِلیوری ہوئی تھی۔ قاسم جانتا تھا کہ شاہین کو نرسنگ ہوم جانے کی کیوں سوجھ رہی ہے۔ اسے کسی سرکاری اسپتال جانا اپنے اِسٹینڈرڈ کے خلاف محسوس ہو رہا تھا۔ قاسم سوچ رہا تھا کہ وہ زمانہ اور تھا جب بچوں کی ولادت گھر پر ہی ہو جایا کرتی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ زمانہ بدل چکا ہے۔ قدریں تبدیل ہو

رہی ہیں۔ دنیا کے ہر میدان میں اب جدیدیت کو ہی فوقیت دی جارہی ہے۔ اسے فیشن ہی نہیں بلکہ ضروریاتِ زندگی میں بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ جدیدیت کے فیشن کا سب سے بڑا فائدہ مادہ پرست افراد اٹھارہے ہیں۔ ہر مادہ پرست شخص اپنی ذہنی صلاحیتوں کے مطابق ازخود ایسے حالات پیدا کردیتے ہیں کہ عوام اس کے جادوئی حصار میں اس وقت تک مقید رہتے ہیں جب تک وہ اس حصار سے نکلنے کی معقول قیمت نہ ادا کردیں۔ ڈاکٹری کے مقدس پیشے میں بھی مادیت پوری طرح سے نہ سہی مگر کافی حد تک تو سرایت کر ہی چکی ہے۔ جن ڈاکٹروں کو مجازی خدا تصور کیا جاتا ہے، انھیں میں سے چند کی مادہ پرستی اس درجہ عروج تک پہنچ چکی ہے کہ کسی کسی موقع پر تو یہ پیشہ بدنام تک ہوجاتا ہے۔ من مانی فیس، نرسنگ ہوم کے کمروں کے من مانے کرائے اور نرسنگ ہوم کی اپنی دواؤں کی دوکانیں۔ صرف دوکانداری، سودے بازی اور مادیت۔ یہی سب سوچتا ہوا قاسم اپنی بیوی شاہین کے ہمراہ گھر سے باہر نکلا۔ اتفاق سے انھیں ایک آٹو رکشہ دروازے پر ہی مل گیا اور وہ دونوں جلد ہی نرسنگ ہوم پہنچ گیے۔ باہر سے دیکھنے میں یہ نرسنگ ہوم جتنا شاندار نظر آرہا تھا، اندر سے اس سے کہیں زیادہ کشادہ اور صاف ستھرا تھا۔ فرش اور دیوار ایسے چمکتے ہوے کہ آئینہ بھی شرما جاے۔ لیڈی ڈاکٹر کے کمرے کے باہر پہلے سے ہی سات آٹھ عورتیں بنچ پر بیٹھی اپنی اپنی باری کی منتظر تھیں۔ شاہین بھی انھیں میں شامل ہو گئی۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد اس کی باری آئی تو وہ قاسم کے ساتھ کمرے میں داخل ہوگئی۔ لیڈی ڈاکٹر نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے اپنی گذشتہ دنوں کی غیر معمولی کیفیت دہرادی۔ لیڈی ڈاکٹر حال سنتی رہی اور اس کے قلم کی نوک لیٹر پیڈ پر برق رفتاری سے پھسلتی رہی۔ ساری کیفیت لکھ چکنے کے بعد اس نے شاہین کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور اسے لے کر اس کمرے سے ملحق دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ قاسم اسی کمرے میں خاموش بیٹھا، ان کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ تقریباً دس

منٹ کے بعد لیڈی ڈاکٹر، شاہین کے ساتھ اندرونی کمرے سے برآمد ہوئی اور قاسم سے مخاطب ہو کر کہا۔

''دیکھیے مسٹر......! ابھی یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ویسے فی الحال سب کچھ نارمل ہے، گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں نے کچھ ٹسٹ لکھ دیے ہیں۔ یہ ٹسٹ آپ آج ہی ہمارے پیتھالا جی سنٹر سے کروا لیجیے اور کل رپورٹ کے ساتھ آیئے تب میں صحیح دوائیں اور صلاح تجویز کر سکوں گی۔'' قاسم نے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور شاہین کے ساتھ باہر نکل آیا۔ پیتھالا جی والے کاؤنٹر پر اسے تمام ٹسٹ فیس کے علاوہ پانچ سو روپیہ مزید، ڈاکٹر کی فیس بھی ادا کرنا پڑی تھی۔ یہاں کل نو سو روپے ادا کرنے سے قبل قاسم نے شاہین کی طرف دیکھا مگر شاہین نے جلدی سے اپنی توجہ دیوار پر آویزاں اُس تصویر پر مبذول کر دی جس میں ایک خوبصورت اور تندرست بچہ اپنے ننھے ہاتھ سے اپنی ماں کا گال چھو رہا تھا۔ وہاں سے رسید لینے کے بعد وہ دونوں ایک تیسرے کمرے میں داخل ہو گیے جہاں تمام ٹسٹ بمشکل تمام آدھ گھنٹے میں انجام پا گیے۔ اس شعبہ کے صدر نے انھیں رپورٹ کے لیے شام سات بجے آنے کے لیے کہا۔

گھر پہنچ کر شاہین نے قاسم کے لیے فوراً کھانا چن دیا کیوں کہ اب پونے دس بج چکے تھے اور قاسم کو دیر ہو رہی تھی۔ اس نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور دفتر کے لیے نکل پڑا۔

شام کو دفتر سے واپسی میں قاسم کو خاصی دیر ہو گئی تھی مگر شاہین نے دیر کی وجہ دریافت نہیں کی بلکہ دس منٹ کے اندر چاے لے کر حاضر ہو گئی۔ قاسم نے خود ہی کہا۔

''آج دفتر میں کام زیادہ تھا اس لیے چھ بج گئے پھر واپسی پر نرسنگ ہوم چلا گیا تھا۔ تمہاری ٹسٹ رپورٹ بھی تو لینی تھی۔''

''اچھا، آپ رپورٹ لے آے۔ اس میں کیا لکھا ہے؟'' شاہین نے عجلت کا

مظاہرہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''پتہ نہیں۔ اِن ڈاکٹروں کی زبان بھی تو الگ ہی ہوتی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آسکا۔ کل صبح ڈاکٹر سے خود ہی دریافت کر لینا۔'' قاسم نے مسکراتے ہوئے رپورٹ شاہین کے حوالے کر دی۔

دوسری صبح دونوں ناشتہ کے بعد نرسنگ ہوم پہنچ گیے۔ ڈاکٹر نے رپورٹ دیکھی اور قاسم سے مخاطب ہو کر کہا۔

''مبارک ہو۔ یہ ماں بننے والی ہیں۔ اب چند ضروری ہدایات بھی نوٹ کر لیجیے...... بچہ اور ماں، دونوں بہت کمزور ہیں۔ بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ انھیں اچھی اور پروٹین، آئرن اور کیلشیم والی غذا کی ضرورت ہے۔ دودھ اور پھل زیادہ سے زیادہ لیں تو بہتر ہوگا۔ اگر کبھی کوئی پرابلم ہو تو مجھ سے فوراً رابطہ کیجیے گا ورنہ اگر کچھ تل بچل ہو گیا تو ذمہ دار آپ ہوں گے۔ بس احتیاط شرط ہے۔'' قاسم بظاہر تو اُس کی باتیں بڑے غور سے سُن رہا تھا مگر اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ اس کا دل ایک عجیب پُرمسرت احساس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ایک ایسی خوشی، جسے وہ کوئی نام نہیں دے سک رہا تھا۔ اِنھیں خیالات میں مگن وہ کب کلینک سے باہر نکل آیا، اسے احساس تک نہ ہوا۔ اس کے خیالات کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب باہر اس نے ایک آدمی کو خود سے مخاطب ہو کر بڑبڑاتے سنا۔ ''......واہ بھئی واہ۔ اِن چند بے ایمان قسم کے سرکاری ڈاکٹروں کا حال تو دیکھیے۔ یہ محترمہ سنٹرل ہسپتال کی لیڈی ڈاکٹر ہیں۔ وہیں پر ان کو اپنی بیوی کو دکھایا تھا۔ درجنوں ٹسٹ لکھ دیے اور سب بہت ضروری۔ ہسپتال میں صرف خون اور پیشاب کی جانچ ہو سکی۔ زیادہ تر مشینیں خراب۔ جب میں نے یہ اطلاع اس لیڈی ڈاکٹر کو دی تو انھوں نے یہاں کا پتہ بتا دیا۔ میں نے سوچا مجبوراً کسی اچھے کلینک میں بھیج رہی ہیں۔ یہاں پر آ کر معلوم ہوا کہ یہ کلینک انھیں کے شوہر نامدار کا ہے۔ سارے ٹسٹ کرواے۔ دوائیں ایسی لکھتی ہیں کہ جن کا

دوسری دوکانوں پر مل سکنا ناممکن ہوتا ہے۔ سب کی سب دوائیں انھیں کی کلینک والی دوکان میں ملتی ہیں......! آج ٹسٹ رپورٹ دیکھ کرانھوں نے ایسی بات کہہ دی کہ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گیے۔ 'بچہ پیٹ میں اُلٹ گیا ہے۔' پورا دن ہے اس لیے فوراً آپریشن کرنا ہوگا ورنہ ماں اور بچے، دونوں کی جان کو خطرہ ہے۔ آپریشن کے لوازمات، ان کی فیس اور کمرے کا کرایہ......بیوی درد سے تڑپ رہی ہے۔ فی الحال اسے کسی دوسرے ہسپتال میں منتقل بھی تو نہیں کرسکتا۔ مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اس لیڈی ڈاکٹر نے مجھے پھنسا دیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں جاؤں، کیا کروں؟'' اس آدمی کی باتیں سُن کر قاسم کا موڈ ایکدم سے خراب ہوگیا۔

''چلیے، آگے بڑھیے۔ آپ کیا اِس کی بکواس سننے لگے۔'' شاہین نے اسے ہلکے سے دھکا دیا۔

''نہیں شاہین، یہ آدمی بکواس نہیں کر رہا ہے۔ یہ صحیح کہہ رہا ہے۔ جیسے جیسے آج کل لوگوں نے پرائیوٹ نرسنگ ہوم کو شوق، فیشن اور بڑے پن کا پیمانہ بنالیا ہے ویسے ویسے مادہ پرست قسم کے ڈاکٹروں میں بے ایمانی بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس قسم کے ڈاکٹروں کا پریشان حال مریضوں کو لوٹنا تو عام بات ہوگئی ہے۔ تم کہیں دور نہ جاؤ اور نہ ہی اس آدمی کے بارے میں سوچو بلکہ خود کی مثال لے لو۔ تمہارے جو بلڈ، یورین اور چھوٹے موٹے ٹسٹ ہوے ہیں، کیا اصولاً اس میں نو سو روپے خرچ ہونے چاہیے تھے؟ میرا خیال ہے کہ اس میں دو سو روپے سے زیادہ ہرگز نہیں لگنے چاہیے تھے۔ مگر تم تو سرکاری اسپتال جانے میں ہی اپنی توہین محسوس کر رہی تھی۔ لوگ کیا کہیں گے؟ خاص کر تمھارے مائکے والے، تمھاری سسرال کو غریب اور لو اِسٹنڈرڈ سمجھیں گے کیوں؟ یہی نہ۔ دیکھو شاہین، میرا خیال ہے کہ کوئی کسی کے بارے میں کچھ نہیں سوچتا۔ سچ تو یہ ہے لوگ خود ہی دوسروں کی سوچ کے بارے میں ایک بے بنیاد رائے قایم کر لیتے ہیں اور انھیں بے وجہ ایسا محسوس

ہوتا ہے کہ لوگ ان کے بارے میں سوچتے ہوں گے۔'' شاہین خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ جب وہ چپ ہوگیا تو شاہین نے صرف اتنا ہی کہا۔

''ٹھیک ہے۔ یہ ہمارا پہلا بچہ ہے۔ اگر آپ اس کی ولادت کسی خیراتی اسپتال میں چاہتے ہیں تو بھلا مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔'' وہ کافی مضمحل نظر آرہی تھی۔

''دیکھو شاہین، تمھارے سوچنے کا طریقہ غلط ہے۔ یہ بچہ صرف تمھارے پیٹ میں ہی نہیں بلکہ اپنے پورے مستقبل سمیت میرے دل اور دماغ میں بھی پل رہا ہے۔ میرا یقین کرو۔ میں، تم دونوں کی بہتری کے سلسلے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھوں گا۔'' قاسم تمام راستے شاہین کو سمجھاتا بجھاتا گھر لوٹا۔ جب شاہین کو یہ محسوس ہوا کہ قاسم ٹھیک ہی کہہ رہا ہے تو اس نے سب کچھ اُسی کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

ولادت کے ایام قریب آتے آتے قاسم نے شاہین کے ساتھ درجنوں مٹرنٹی ہوم اور اسپتالوں کی خاک چھانی مگر اب تک کسی اطمینان بخش نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ آج تو شاہین کو لیبر پین بھی شروع ہوگیا تھا۔ قاسم نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کیے اور اپنی والدہ کو بھی تیار ہونے کی ہدایت دیتا ہوا آٹو رکشہ لانے کے لیے چل دیا لیکن وہ اب تک یہ طے نہیں کرسکا تھا کہ اسے کس اسپتال یا مٹرنٹی ہوم میں جانا چاہیے۔

●

نیکی کا انعام

یہ شہر ہی کچھ اس قسم کا ہے کہ راج دھانی کی ہر چھوٹی بڑی ہلچل کا براہ راست اثر، یہاں کے عوام پر برق رفتاری سے پڑتا تھا اور تین چار گھنٹوں بعد ہی پورا شہر اُس وبا کے زیر اثر نظر آنے لگتا، جس کے جراثیم راجدھانی میں پیدا ہوتے۔ سب سے زیادہ اثر راجدھانی کی مذہبی سیاست کا اِسی شہر پر پڑتا تھا۔ وجہ کھلی ہوئی تھی۔ اصطلاحاً اِس شہر کو مندروں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ ملک کی تازہ حالیہ سرکار کا نفوذ بھی ایک مسجد کو منہدم کر کے اس کے عوض مندر بنانے کے وعدے کے نام پر ہوا تھا۔ ان تمام حالات سے ہٹ کر، اس شہر کے سلسلہ میں ایک سب سے اہم بات یہ ہے کہ مندروں کا شہر ہونے کے باوجود، اس شہر کا ایم. پی. مرکزی سرکار کی پارٹی کا نہ ہو کر مخالف پارٹی کا تھا جو مرکزی سرکار کی آنکھوں کی کر کری بنا ہوا تھا۔ اس شہر کے ایک لوکل نیتا لطیف حامد کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ ایک سچے ہندوستانی اور سماج سیوک کے مانند آج بھی بغیر تفریق مذہب و ملت، شہر والوں کی خدمات پوری ایمانداری سے کرتا۔ اس علاقے کا ایم. ایل. اے.، جو کہ مرکزی سرکار کی پارٹی کا تھا، اس سے لطیف کی ایکدم نہیں بنتی تھی بلکہ دونوں میں ہمیشہ رسّا کشی جیسے حالات بنے رہتے تھے۔ ایم. ایل. اے. نے ایک روز بحث مباحثے کے درمیان لطیف کو دھمکی بھی دی تھی۔ اس نے کھلے لفظوں میں کہا تھا کہ مجھ سے ہوشیار رہنا۔ میں ایک نہ ایک دن تمھاری ایمانداری سمیت تمھیں جیل بھجوا کر ہی دم لوں گا۔ مگر لطیف نے اس کے چیلنج پر کان تک نہ دھرے اور اسی تندہی سے سماج کی خدمت میں مصروف رہا۔

جب بھی شہر کے حالات بگڑتے تب ایم. ایل. اے. کے مصاحبوں کے بولی

آوازے بھی لطیف پر تیز تر ہوتے جا رہے تھے۔ اگر وہ ناساز گار حالات میں کسی مسلمان کی مدد کرتا تو ایم.ایل.اے. اور اس کے مصاحب اس کی اس خدمت کو اس کے مذہب سے جوڑتے۔ اس کے برعکس اگر وہ کسی ہندو کا مددگار ہوتا تو یہی لوگ اسے 'ہندوؤں کے شر سے تحفظ کی غرض سے ان کی مصاحبت' کا نام دیتے مگر لطیف بھی اس معاملے میں چکنا گھڑا ہی ثابت ہوا۔ اس پر کسی کے بولی آوازے کا کوئی اثر ہی نہیں پڑتا تھا۔ کچھ ہو، اس کی اس ایماندارانہ کارکردگی کا اتنا اثر تو عوام پر ضرور پڑا تھا کہ ہر کس و ناکس، اُس پر صدق دل سے اعتبار کرتے تھے، جو بڑی بات ہے۔

گرمی پورے شباب پر تھی۔ اس سے مقابلے کی خاطر حسب حیثیت ہر کس و ناکس کمر بستہ نظر آ رہے تھے۔ اس مہم میں کسی نے اپنے گھر کا اے.سی. چالو کروالیا تھا تو کسی نے پرانے کولر کی جگہ نیا خریدا۔ کسی نے پرانے کی مرمت کروائی مگر پچھتا رہا ہے کہ کاش اس کا پمپ نیا ہی لے لیتا تو بہتر تھا۔ بجلی کے پنکھے والوں کو اپنے گھروں میں لگے پنکھوں سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ سب کے سب، مالک کی انگلی کے اشارے پر ناچ کر ان کا دل خوش کرنے لگے تھے۔ اب بیشتر حضرات کو اگر شکایت تھی تو بجلی گھروں سے کیونکہ ان لوگوں نے من مانے ڈھنگ سے علاقے علاقے کی بجلی کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ ان حالات میں چند ٹٹ پنجیے نیتاؤں کی ضرور بن آئی تھی مگر ایسے نیتاؤں کی نیتا گیری زیادہ اثرانداز نہ ہو سکی۔ اس شہری برق نے سست رفتاری کے تمام ریکارڈ اپنے نام درج کروا لیے تھے۔ ان سب سے مستثنیٰ، وہ لوگ جن کا بجلی، پنکھوں، کولر اور اے.سی. سے کچھ لینا دینا نہ تھا وہ دھوپ ڈھل جانے کے بعد شام کے پہر چوک کے گلزار علاقوں میں گھوم گھوم کر ہاتھ سے جھلے جانے والے پنکھوں کی پرکھ اور مول بھاو میں مشغول دکھائی دے رہے تھے۔ سستے سے سستے پنکھوں کو بھی جھل جھل کر آزماتے اور مانگی گئی قیمت سے کچھ نہ کچھ کم ادا کرنے میں ہی سمجھداری محسوس کرتے۔ سڑکوں کے کنارے آم، انگور، ککری، تربوز اور

خربزہ جیسے موسمی پھلوں کی بھرمار تھی۔ بازار سے واپسی پر ہر کوئی حسب حیثیت ان میں سے کچھ نہ کچھ ضرور خریدتا تھا مگر یہاں بھی مول بھاو کا بازار خاصا گرم تھا۔ لطیف نے بھی آدھا کیلو ککڑی اور دو کیلو خربزہ خریدا تھا۔ ہر چند کہ اس کے بچوں کو آم زیادہ پسند تھے مگر اس کی جیب آم کا بوجھ اٹھا سکنے سے قاصر تھی چنانچہ اس نے ککڑی اور خربزے جیسے سستے پھلوں پر ہی اکتفا کیا۔ گھر واپسی کے لیے کافی تگ و دو کے باوجود اسے کوئی رکشہ نہ مل سکا۔ حالانکہ ابھی شام کے صرف سات بجے تھے اور چاروں طرف اچھا خاصا اجالا پھیلا ہوا تھا پھر بھی رکشہ نہیں مل رہا تھا۔ 'ہوسکتا ہے کہ گرمی کی وجہ سے کم رکشے نکلے ہوں'۔ وہ یہی سوچتا ہوا پیدل ہی گھر کی طرف چل دیا جبکہ اس علاقے سے اس کا گھر تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھا۔ ابھی وہ نصف راہ بھی طے نہیں کر پایا تھا کہ اچانک پورب میں، گھنٹا گھر روڈ کی طرف سے شور اور بھگدڑ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ فطری گھبراہٹ کے ساتھ اس کے قدم تیزی سے گھر کی طرف بڑھ چلے۔ اس نے ذرا رک کر گھنٹا گھر والی سڑک کی طرف دیکھا بھی کہ آخر ہوا کیا ہے مگر وہ کچھ اندازہ تک نہ لگا سکا کیوں کہ ہر کس و ناکس اور رکشہ، سائکل والے، جدھر سینگ سمائی بھاگتے ہی نظر آرہے تھے۔ مذہبی نعرے بازیوں سے اس نے اتنا اندازہ تو لگا ہی لیا تھا کہ شاید ہندو مسلم فساد ہوگیا ہے۔ نہ کوئی کسی سے کچھ کہہ رہا تھا نہ کوئی کسی کی سننا چاہ رہا تھا۔ ہر چند کہ لطیف کی رفتار بھی خاصی تھی مگر انجانے خوف کی وجہ سے اس پر خواب جیسی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ اس کے پیر جیسے آگے بڑھ ہی نہیں رہے تھے۔ جب بھی اس کا گذر ہندوؤں کے محلے سے ہوتا تو وہ اپنا انگوچھا چہرے کے گرد اس طرح لپیٹ لیتا کہ ڈاڑھی نظر ہی نہ آتی۔ اس کے برعکس مسلم علاقوں سے گذرتے وقت وہ انگوچھا ہٹا لیتا۔ خدا خدا کر کے کافی مشقت کے بعد اس کے محلے کی گلی دکھائی دی تو وہ ایسے خوش ہوا جیسے خواب میں حادثے کے درمیان آنکھیں بند کر لینے پر انسان خود کو محفوظ سمجھ لیتا ہے۔ گھر پہنچ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ محلے والوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ

کل کے مورتی بسر جن کے جلوس میں گیا ہوا ایک ہندو لڑکا آج تک گھر واپس نہیں آیا۔ وہ جلوس مسلم محلے سے بھی ہو کر گذرتا ہے اس لیے ہندوؤں کا الزام تھا کہ موقع پا کر کسی مسلمان نے اس کا قتل کر دیا ہوگا یا قتل کے ارادے سے قید کر لیا ہوگا۔ پبلک، لڑکے کی برامدگی کے لیے پولس پر دباو ڈال رہی تھی۔ جب پبلک کو لگا کہ پولس کچھ نہیں کر رہی ہے تو انھوں نے حلقے کے تھانے پر پتھراو شروع کر دیا۔ بات زیادہ بگڑی تو معاملے نے پولس اور پبلک سے ہٹ کر ہندو اور مسلمان دنگے کی شکل اختیار کر لی۔ ساری حقیقت سے آشنا ہونے کے بعد لطیف کافی گھبرایا ہوا اپنے گھر کے دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا تا کہ تازہ خبریں ملتی رہیں۔

ویسے تو شام کو چلنے والے سنسکرت اسکول میں چھٹیاں شب کے آٹھ بجے ہوا کرتی تھیں مگر آج شہر کے ناسازگار حالات کے پیش نظر اسکول میں چھٹی جلد ہی کر دی گئی تھی تا کہ رات گہرانے یا کرفیو نافذ ہونے سے قبل سارے بچے اپنے گھر پہنچ جائیں۔ چھٹی ہونے کے بعد اس اسکول کے بچے چار چار، چھ چھ کی ٹولیاں بنا بنا کر اپنے گھروں کے لیے نکل پڑے۔ اس اسکول کے بچے زعفرانی رنگ کے کرتے اور سفید دھوتی میں ملبوس تھے۔ اچانک پولس کار کا ہوٹر سُنائی دیا اور مائک پر اعلان ہونے لگا کہ ''ناسازگار حالات کی بنا پر پورے شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے۔ ہر شخص اپنے گھروں میں چلا جائے۔ اگر اس حکم کی تعمیل فوراً نہ ہوئی تو سڑک پر نظر آنے والے کسی بھی شخص کو بے دریغ گولی مار دی جائے گی۔'' اس اعلان کے بعد جس کی جدھر سینگ سمائی، بھاگ نکلا۔ سڑک تیزی سے ویران ہوتی جا رہی تھی۔ اچانک سنسکرت اسکول کی طرف سے چار بچے ادھر ہی آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ وہ بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ ان میں سے دو بچے تو زاروقطار رو بھی رہے تھے۔ گھبراہٹ میں وہ پناہ حاصل کرنے کی غرض سے جس گھر کے دروازے پر جاتے وہ بند نظر آتا۔ جب لطیف سے ان معصوموں کی کس مپرسی دیکھی نہ گئی تو

اس نے خود ہی آگے بڑھ کر انھیں اپنے گھر میں بلا لیا اور دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

''تم لوگ ایکدم مت گھبرانا۔ کوئی تمھارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھو۔ جب تک حالات درست نہ ہو جائیں، یہیں اطمینان سے رہو۔ جیسے ہی حالات تھوڑے ٹھیک ہو جائیں گے، میں کوئی بھی جتن کر کے تم لوگوں کو تمھارے گھروں کو پہنچا دوں گا۔'' لطیف کے دلاسا دینے کے بعد بچے قدرے مطمئن نظر آنے لگے تھے مگر خوف و ہراس، اب بھی ان کی آنکھوں میں صاف نظر آ رہا تھا۔

بچے چونکہ ہندو برہمن تھے اس لیے لطیف نے بیوی سے کہا کہ آج صرف سادہ کھانا پکاؤ۔ سب کے لیے۔ گھر میں اتفاق سے ایک لوکی موجود تھی چنانچہ بیوی نے لوکی کی سبزی اور روٹی پکائی۔ بچے دہشت کی وجہ سے کھانا کھانے کو تیار نہ تھے مگر لطیف اور اس کی بیوی نے بڑی مشکلوں سے بہلا پھسلا کر بچوں کو کھانا کھلایا اور فرش پر بستر لگا کر اپنے بچوں کے ساتھ، ان بچوں کو بھی لٹا دیا۔ بچے خاموش خاموش، ڈرے ڈرے سے کبھی ایک دوسرے کو دیکھتے تو کبھی لطیف اور اس کی بیوی کو۔ بچوں کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ آخر بارہ بجتے بجتے بڑی مشکل سے بچوں کو نیند آئی۔ ابھی ان کی نیند گہری بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ لائٹ چلی گئی تو فوراً لطیف نے ہاتھ سے جھلا جانے والا پنکھا نکال کر ایک اپنی بیوی کو دیا اور دوسرا پنکھا خود لے کر بچوں کو جھلنے لگا تا کہ ان معصوموں کی نیند نہ کھل جائے۔ ابھی دس منٹ بھی نہیں گذرے ہوں گے کہ کہیں دور سے 'ہر ہر مہادیو' اور نعرۂ تکبیر 'اللہ اکبر' کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اندھیرے اور رات کے سناٹے نے ماحول کو اور خوف ناک بنا دیا تھا۔ آوازیں سن کر لطیف تو جھپٹ کر کھڑکی کی طرف بھاگا مگر اس کی بیوی وہیں بیٹھی تمام بچوں کو پنکھا جھلتی رہی۔ لطیف کی واپسی پر اس کی بیوی نے دریافت کیا۔

''کیسا شور تھا؟'' اس کی آواز میں بھی خوف تھا۔

''قسائی محلے کی طرف سے شور کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پتہ نہیں کیا ہوا ہوگا؟ اب تو شاید کرفیو میں ڈھیل بھی نہ ملے۔ ہو سکتا ہے کہ سختی اور بھی بڑھا دی جائے۔''لطیف نے قدرے متفکرانہ انداز میں کہا۔

''ان معصوم بچوں کو کیسے ان کے گھروں کو پہنچایا جائے۔ بیچارے بہت خوف زدہ لگ رہے ہیں۔ پتہ نہیں اِن غریب کی ماؤں کا کیا حال ہوگا۔ بھئی تم کسی بھی طرح صبح انھیں ان کے ماں باپ کے پاس ضرور پہنچا دینا۔''لطیف کی بیوی نے بڑے ممتا بھرے لہجے میں کہا تو لطیف نے اس سے وعدہ کر لیا اور صبح ہونے کے انتظار میں بیٹھا بچوں کو پنکھا جھلتا ہوا دور سے آنے والی ناگوار آوازوں پر کان لگا کر اُنگتا رہا۔ اسے تمام رات نیند نہیں آ سکی۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ وہ بھی اپنے دل میں امید کی ہزاروں کرنیں لے کر اٹھا اور گھر کے صدر دروازے پر آ کر اس کی جھری سے باہر جھانک کر دیکھنے لگا۔ چوراہے پر چھ سات پولس کے سپاہیوں کے علاوہ وہ ایم.ایل.اے. بھی کھڑا تھا جو لطیف سے خدا واسطے کا بیر رکھتا تھا۔ وہ پولس والوں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ لطیف نے دروازہ کھولا اور ہمت کر کے سنبھلتا ہوا اُن کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ تھوڑا آگے بڑھا ہوگا کہ تمام سپاہی کھڑ بڑا کر کھڑے ہو گیے اور اس کی طرف لپکے۔ لطیف پہلے تو ذرا ٹھٹکا مگر پھر سنبھل کر ان سے مخاطب ہوا۔

''دروغا جی، ایک بہت ضروری بات کرنی ہے......!''وہ اپنی بات پوری بھی نہیں کر سکا تھا کہ ایک سپاہی نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا۔

''دیکھیے نیتا جی، چپ مار کے گھر میں چلے جائیے۔ کاہے کو کرپھو میں باہر نکل آئے ہیں۔ ابھی صاحب کا راؤنڈ ہونے والا ہے۔ اگر دیکھ لیں گے تو......!''لطیف کو پولس والوں سے بات کرتے دیکھ کر وہ ایم.ایل.اے. بھی ذرا اور قریب آ گیا اور پولس والوں کو مخاطب کر کے بولا۔

"آنے دو بھائی ان کو۔ نیتا گیری کی کوئی نئی جگت سوجھی ہوگی۔" اس کا انداز

مذاق اُڑانے والا تھا۔

"للولال، تمھارا منھ جب بھی کھلتا ہے، ہمیشہ زہر ہی اُگلتے ہو۔ خیر، میں اس وقت کسی ضروری کام سے نکلا ہوں۔ تمھارے منھ نہیں لگنا چاہتا۔ مجھے اپنا کام کر لینے دو۔ ابھی چلا جاؤں گا تو پولس والوں کے ساتھ بیٹھ کر منھ بُلا رو کرنا۔" اس نے ناگواری کے ساتھ کہا تو للولال نے برا سا منھ بنا کر نفرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"ابھی تم نے ہمارا زہر اُگلنا دیکھا کہاں ہے؟ جس دن زہر اُگلوں گا تو لہر بھی نہیں آئے گی۔ ویسے میں تم جیسے ٹُٹ پُنجیے لوگوں کو منھ لگانا پسند نہیں کرتا۔" لطیف کو بُرا تو بہت لگا تھا مگر اس نے ضبط کیا۔ اسے تو بچوں کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اس نے ایک سپاہی سے کہا۔

"دیکھئے داروغا جی، کل شام کی بھگدڑ میں سنسکرت اسکول کے چار بچے گھبرائے ہوئے ایک ایک دروازے پر جا رہے تھے مگر ہر گھر کا دروازہ بند ہونے کی وجہ سے انھیں کہیں پناہ نہ مل سکی۔ ان معصوموں کی تڑپ اور بیچارگی مجھ سے نہیں دیکھی گئی اور میں نے ان کو اپنے گھر میں پناہ دے دی۔ انھیں کھانا کھلا کر سلا دیا۔ وہ بچے اپنے ماں باپ سے ملنے کے لیے بہت پریشان ہیں۔ ان کے ماں باپ بھی تڑپ رہے ہوں گے۔ میری مدد کیجیے تاکہ میں ان معصوموں کو ان کے گھر پہنچا سکوں۔ کو فیو پاس کا ہی انتظام کروا دیجیے گا تو مہربانی ہوگی۔ بچوں کی ماں دعائیں دیں گی۔" لطیف نے پولس والوں سے گذارش کیا تو ان میں سے ایک کا دل پگھل گیا اور اس نے لطیف کو تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ انسان نہیں بلکہ دیوتا ہیں۔ اس نیک کام میں مَیں آپ کی پوری مدد کروں گا۔ ابھی بڑے صاحب اور مجسٹریٹ صاحب کی گاڑیاں ادھر، دورے پر آتی ہوں گی۔ میں ان سے کہہ کر انھیں کی گاڑی پر بچوں کو ان کے گھر چھڑوا دوں گا۔ کلکٹر صاحب

اگر خوش ہوئے تو آپ کو انعام بھی دیں گے۔ بھلا آج کے زمانے میں ایسے بھلے مانس کہاں ملتے ہیں جبکہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں، ایسے سمے میں چار ہندو بچوں کی جان بچا کر آپ نے ہندو سماج پر اُپکار کیا ہے۔ سرکار اور سماج سیوی سنستھان بھی آپ کو انعام ضرور دیں گے۔ آپ تو ایک مثالی کردار ہیں۔ بس اب آپ گھر جا کر 'صاحب' کی گاڑی کی آمد کا انتظار کیجیے۔'' اور لطیف مطمئن ہو کر گھر واپس آ گیا جبکہ للو لال سپاہیوں سے سرگوشی کرنے میں مشغول ہو گیا۔ اسے بھی 'صاحب' کی گاڑی کے آنے کا انتظار بے صبری سے تھا۔

اس دوران اخبار بھی آ گیا تھا جس میں بیشتر خبریں شہر میں ہوئے فساد پر ہی مبنی تھیں۔ وہ اخبار پڑھ ہی رہا تھا کہ پولس کار کے ہوٹر بجنے کی آواز پر چونکا۔ اخبار تہہ کر کے ایک طرف رکھنے کے بعد سڑک پر کھلنے والی کھڑکی سے جا لگا۔ اس نے سر گھما کر چوراہے کی طرف دیکھا۔ تین چار پولس کاریں چوراہے پر آ کر رُک گئیں اور افسران وہاں موجود سپاہیوں اور للو لال سے گفتگو کرنے لگے۔ تھوڑے عرصے کے بعد ہی لطیف نے دو سپاہیوں کو اپنے گھر کی طرف آتے دیکھا۔ دروازے پر دستک کا انتظار کیے بغیر ہی اس نے نیچے اتر کر دروازہ کھول دیا۔ اس سے قبل کہ سپاہی اس سے ہمکلام ہوتا، افسر کی کار بھی اس کے گھر کے دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ کار کا پچھلا دروارہ کھلا اور ایک بارعب شخص نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''آپ غالباً مسٹر لطیف ہیں۔ مجھ سے میرے جوانوں نے آپ کے بڑکپن کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، اس سے میرا دل بہت خوش ہوا۔ اب آپ ان بچوں کو لے کر جیپ میں بیٹھ جائیے اور میرے ساتھ حلقے کے تھانے پر چلیے۔ وہاں پر ان بچوں کے ملنے کی رپورٹ درج کروا دیجیے تاکہ قانون کے مطابق انھیں ان کے والدین کے سپرد کیا جا سکے۔ چونکہ آپ پڑھے لکھے ہیں، اس لیے اس سلسلے میں زیادہ وضاحت کیا کروں۔

میں نے وائرلیس کروا دیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اب تک ڈی.ایم.صاحب پہنچ بھی چکے ہوں۔ واقعی آپ نے بہت نیک کام کیا ہے۔'' یہ سن کر لطیف فوراً گھر میں واپس آیا اور بچوں کو لے کر خوشی خوشی جیپ میں بیٹھ گیا۔ آج لطیف کو اپنی شخصیت میں کافی وزن محسوس ہو رہا تھا۔ اتنے بڑے بڑے ادھیکاری اور ڈی.ایم.صاحب۔ وہ سب کی تعریفوں کا مرکز بنے گا۔ گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھی اور فراٹے بھرتی ہوئی نکل گئی۔ اس کی بیوی جیپ میں بیٹھے ہوئے لطیف کی اوجھل ہوتی ہوئی صورت کو آخیر تک غور سے دیکھتی رہی۔

دوسری صبح کے اخبار میں فساد سے متعلق چھوٹی بڑی ڈھیروں خبریں تھیں۔ 'فلاں محلے میں ایک شخص نے کسی راہگیر کو چاقو مار دیا، فلاں محلے میں یکے بعد دیگرے تین بم پھٹے، شہر میں دنگا کروانے کی غرض سے آئے دو پاکستانی جاسوس گرفتار کیے گیے، وغیرہ وغیرہ۔' لیکن ان سب سے ہٹ کر پہلے صفحے پر بڑی بڑی سرخیوں میں جو خبر عام لوگوں کی کشش کا مرکز بنی تھی وہ کچھ اس طرح تھی:

'شہر اُتری کے ایم.ایل.اے.شری للّو لال جی کی مستعدی نے کل سے گمشدہ چار معصوم سنسکرت طالب علموں کی جان بچائی اور انھیں ان کے والدین کے سپرد کیا—— اس سلسلے میں لطیف نام کے ایک بدمعاش کی گرفتاری بھی عمل میں آئی ہے۔ اس نے بچوں کو قتل کرنے کے ارادے سے اپنے گھر میں قید کر رکھا تھا۔ ایم.ایل.اے.شری للو لال جی نے آشنکا جتائی ہے کہ لطیف کا سمبندھ کسی خطرناک آتنکی گروہ سے ہوسکتا ہے۔ پولس معاملے کی جانچ کر رہی ہے۔'

●

بڑکپن

عوام میں بیشتر افراد ایسے ہوتے ہیں جن میں زیادہ تر لوگوں کی اولادیں اپنی روزی کا ذریعہ اپنے والد کے پیشے کو بنالیتے ہیں۔ مگر آج کی بدلتی قدروں کے پیش نظر اکثر والدین اپنی اولادوں کے لیے بہتر تعلیم کے خواہاں ہوتے ہیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے ساتھ وہ نوکری کے علادہ من پسند اور منافع بخش کاروبار کی طرف پھر جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں زیادہ تر والدین یہی چاہتے ہیں کہ ان کی اولاد اُس راہ کا انتخاب کرے جو والدین کی پسندیدہ ہوں۔ اگر انجینیر اپنی اولاد کو انجینیر بنانے کا خواہاں ہوتا ہے تو ڈاکٹر اپنی اولاد کی ڈاکٹر بنانا چاہتا ہے۔ اس فکر کے برعکس بہت سے فلسفی یہ مانتے ہیں کہ اگر بچوں میں صحیح فیصلہ لینے کی صلاحیت ہے تو والدین کو بچوں کے مستقبل کا تعین انھیں پر چھوڑ دینا چاہیے، اس طرح کے بچے زندگی کی دوڑ میں زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ اسی خیال کے پیش نظر منگلا پرشاد نے بیٹے کی خواہش کے مطابق اس کا داخلہ 'لا کالج' میں کروادیا تھا کیونکہ اس کا بیٹا نیرج، وکیل بننا چاہتا تھا۔ ایل. ایل. بی. کا امتحان پاس کرنے کے بعد بھی جب اسے اپنی تعلیم ادھوری محسوس ہوئی تو اس نے مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ایل. ایل. ایم. میں داخلہ لے لیا اور اس میں بھی امتیازی نمبروں کے ساتھ کامیابی حاصل کی تو اس کے والد نے بیٹے کو مبارکباد پیش کرتے ہوے اس سے کہا۔

''امتحان میں کامیابی تجھے بہت بہت مبارک ہو بیٹا۔ اب تو جلدی سے اپنا رجسٹریشن کرواکے پریکٹس بھی شروع کردے۔'' انھوں نے پرمسرت لہجے میں کہا تو نیرج نے جواب دیا۔

''میری تعلیم کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے بابو جی۔ میرا اصل مقصد صرف 'وکیل صاحب' کہلوانا نہیں بلکہ اب میں پی.ایچ.ڈی. کرنے کا خواہاں ہوں۔ میں اب اُن وجوہات کا پتہ لگانا چاہتا ہوں جس کے سبب آج ہمارے ملک میں لاکھوں افراد طرح طرح کے مقدمات میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ایسے افراد کے مقدموں کے فیصلے میں زیادہ تاخیر کی وجہ کیا ہے۔ ہمارے ملک کی عدالتوں میں لاکھوں مقدمے عرصے سے فیصلے کے منتظر کیوں ہیں۔ سسٹم میں آخر کیا کمی ہے اور اِس کمی کو کس طرح دور کیا جا سکتا ہے؟ کتنے مقدمے تو ایسے ہوتے ہیں کہ پیروی کرنے والا مر تک جاتا ہے مگر مقدمہ نہیں ختم ہوتا۔ کتنوں کے گھر تک بک جاتے ہیں......... یہ بہت بڑا سوال ہے بابو جی، جس کا جواب میں ریسرچ کے ذریعہ تلاش کرنا چاہتا ہوں۔'' اتنا کہتے کہتے نیرج کافی جذباتی ہو گیا تو منگلا پرشاد نے اسے اپنے دلایل سے مطمئن نے کی کوشش کی۔

''ہماری عدالتوں میں مدتوں سے چل رہے مقدمات میں تاخیر کی اصل وجہ نہ تو قانون کی خامی ہے نہ ہی عدالتوں کی لاپرواہی۔ اگر ان مقدمات کا مطالعہ غور سے کیا جاے تو معلوم ہوگا کہ اس قسم کے بیشتر مقدمات کے فیصلوں میں تاخیر کا اصل سبب فریقین ہوتے ہیں، عدالت نہیں.......... اگر تو ان معاملات پر ریسرچ کر کے اس کا کوئی معقول حل تلاش کرنا چاہتا ہے تو یہ کام تو پریکٹس کے ساتھ بھی کر سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس قسم کی ریسرچ میں تیری پریکٹس مخل ہونے کے بجاے معاون ہوگی۔'' انھوں نے اپنے طور پر بیٹے کو اس انداز سے سمجھایا کہ وہ باپ کی صلاح پر وکالت شروع کرنے کے لیے راضی ہو گیا۔

''ٹھیک ہے بابو جی۔ آپ کی صلاح درست ہے اس لیے میں رجسٹریشن کے بعد کام شروع کرنے جا رہا ہوں۔ نیرج نے کہا تو منگلا پرشاد بہت خوش ہوے۔ وکالت شروع کرنے سے قبل انھوں نے بیٹے کو ان الفاظ کے ساتھ آخری نصیحت کی۔

''اس پیشے کے تقدس کے ساتھ خود میں بڑکپن پیدا کرنے کی کوشش بھی کرنا کیونکہ یہی چیز اس پیشے کے توسط سے تجھے سدرہ تک لے جانے معاون ہوگی۔ ہر ضرورت مند کا خیال اس کی ضرورت کے لحاظ سے رکھنا، اپنے اندازے اور سہولت کے لحاظ سے نہیں۔'' اور اس نے پوری عقیدت کے ساتھ باپ کے پیر چھو کر ان کی دعائیں لیں۔

ایشور کا نام لے کر نیرج نے شہر کے ایک نامی گرامی وکیل کی سرپرستی میں بحیثیت جونیر، وکالت شروع کر دی۔ اُس کی محنت، لگن اور ایمانداری نے اُسے کب جونیر سے سینیر بنا دیا، اسے اس کا احساس تک نہ ہو سکا۔ اس پیشے سے منصوب ہونے کے بعد جلد ہی اُس کا شمار شہر کے بڑے وکلا میں کیا جانے لگا۔ چونکہ مادیت اسے چھو بھی نہیں گئی تھی اس لیے عوام میں وہ زیادہ پسندیدہ بن گیا تھا۔ نیرج کی کامیابی اور بڑھتی شہرت کے سبب منگلا پرشاد پھولے نہیں سماتے تھے۔ نیرج نے چونکہ پیسوں کو کبھی اہمیت نہیں دی اس لیے پیسہ کمانے کی غرض سے اس نے اپنی کوئی بھاری بھرکم فیس طے نہیں کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا یہ عمل اس کی شخصیت میں بڑکپن ضرور پیدا کر دے گا۔ پیسے کو فوقیت نہ دینے کے سبب وہ عوام سے قریب تر ہوتا گیا جس کی وجہ سے اس پر کام کا بوجھ بہت بڑھ گیا تھا۔ کام کا بوجھ زیادہ بڑھ جانے کے سبب وہ کچھ چڑچڑا بھی ہو گیا تھا۔ چڑچڑے پن اور کام کی یکسانیت سے اکتاہٹ کی وجہ سے وہ اپنا زیادہ تر کام جونیروں کے سپرد کر دیا کرتا تھا جبکہ اس کے زیادہ تر موکلوں کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ ان کا مقدمہ نیرج خود دیکھے جو تن تنہا نیرج کے لیے ممکن نہ تھا۔

○

آج بارش کے بعد موسم خوش گوار ہو گیا تھا اس لیے نیرج نے سیر و تفریح کی غرض سے بیوی کو تیار ہونے کے لیے کہا تو وہ خوش ہو گئی اور مسکرا کر بولی۔

''کیا بات ہے جو آج آپ بہت مسرور نظر آ رہے ہیں؟''

''روز بروز بڑھتے کام کی وجہ سے میں چاہ کر بھی تمھیں وقت نہیں دے پاتا، جس کا احساس مجھے بخوبی ہے۔اب میں نے طے کیا ہے کہ ہفتے کی ہر شام تمھارے ساتھ سیر وتفریح میں گزارا کروں گا۔اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔میں گاڑی نکال رہا ہوں۔'' اتنا کہہ کر نیرج گیراج کی طرف چل دیا اور اس کی بیوی اپنے کمرے کی طرف۔تقریباً پندرہ منٹ کے بعد جب وہ تیار ہو کر باہر نکلی تو نیرج کو اپنا منتظر پایا۔ابھی نیرج نے کار اسٹارٹ ہی کی تھی کہ اس کے گھر کے صدر دروازے پر ایک عدد خوبصورت سی کار آ کر رکی تو اس نے اپنی کار کا انجن بند کر دیا۔اس کار سے اُتر کر دو آدمی اُس کی طرف بڑھے تو وہ بھی اخلاقاً اپنی کار کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔اس کی بیوی کو محسوس ہوا کہ اب شاید آج کا پروگرام ہی ملتوی ہو جائے۔قیمتی سوٹ میں ملبوس نو وارد دیکھنے میں ہی کوئی پڑھا لکھا اور اونچی سوسائٹی کا فرد لگ رہا تھا۔جب وہ دونوں نیرج کے قریب پہنچے تو ان میں سے ایک نے کہا۔

''کیا میں مسٹر نیرج ایڈوکیٹ سے ہمکلام ہونے کا شرف حاصل کر رہا ہوں؟''

اس نے نرم لہجے میں دریافت کیا۔

''جی ہاں، فرمائیے.....!''

''میں پروفیسر رویندر گپتا، نیورولاجسٹ، ایمس کا ڈائرکٹر ہوں۔ ناوقت مخل ہونے کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ دراصل مجھے آپ کا تھوڑا سا وقت درکار ہے۔'' اس کا لہجہ نہایت شگفتہ تھا۔

''دِل کُم پروفیسر گپتا۔ میں کیا، تمام ملک آپ کے نام اور خدمات سے واقف ہے۔فرمائیے، کیسے زحمت فرمائی؟'' نیرج نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا تو اس نے اپنا مدعا بیان کر دیا۔

''آیندہ دوشنبہ کو، یعنی پرسوں کورٹ میں میرے ایک نہایت اہم کیس پر آرگومنٹ ہونا ہے۔اسی سلسلے میں آپ کو زحمت دینے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں۔'' اُس

نے خمیدہ پیشانی کے ساتھ التجا کی تو پل بھر کے توقف کے بعد اس نے قدرے بے رخی کے ساتھ کہا۔

''ساری، پروفیسر گُپتا۔ اِس وقت تو میں اہلیہ کے ساتھ ذرا باہر جا رہا ہوں اور دوشنبہ کو بھی نہایت مصروف ہوں اس لیے......!'' نیرج کے اتنا کہنے کے بعد وہ مزید اصرار کیے بغیر اپنی کار کی طرف مڑ گیا اور نیرج کی کار ایک جھٹکے کے ساتھ فراٹے بھرتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل گئی۔ اس کی بیوی کو ڈاکٹر کے ساتھ نیرج کا رویہ اچھا نہیں لگا تھا پھر بھی وہ خاموش ہی رہی۔

○

گزرتے وقت کے ساتھ نیرج کی شہرت اور اس کے پاس آنے والے مقدمات میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔ زیادہ سے زیادہ مقدموں کے سبب اور بیشتر میں بحسن وخوبی کامیابی کی بدولت اب نیرج نے خود کو ایک عجیب وغریب مثلث میں مقید کر لیا تھا۔ اُس کے پاس آنے والے روز بہ روز نئے نئے مقدموں کے لڑنے کی منظوری کا فیصلہ مقدموں کی اہمیت کے بجائے نیرج کی مرضی پر منحصر ہوتا تھا جس کے سبب وہ اکثر پروفیسر گپتا جیسے اہم اور نازک مقدموں کو نظر انداز کر دیتا تو کبھی غیر اہم مقدموں میں زیادہ دلچسپی لیتا۔ اس کی کاروباری زندگی کی صراحت پہلے سے قطعی مختلف ہو چکی تھی۔ اُس کے اِس طریقۂ کار پر اکثر اس کے والد اور بیوی نے اُسے ٹوکتے بھی تھے مگر اپنی مصروفیات اور الجھنوں کے باعث اس نے والد کی نصیحت اور بیوی کے مشورے پر توجہ دینا چھوڑ دیا تھا۔

وقت اور حالات، اِنسان کو کب اور کِس موڑ پر لے جا کر کھڑا کر دیں، اس سلسلے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ صبح کے نو بجے تھے۔ نیرج اپنے موکلوں میں گھرا، آج کے مقدموں کے سلسلے میں انھیں طرح طرح کی ہدایتیں دینے کے ساتھ بیانات بھی رٹوا رہا تھا کہ اُسے گھر کے ایک ملازم نے اطلاع دی کہ'' مالکن نے اندر بلایا ہے۔ بابو جی

اچانک بے ہوش گیے ہیں۔'' تو نیرج وہاں سے اٹھ کر سیدھا اپنے والد کے کمرے کی طرف چل دیا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ اس کے والد بستر پر بے حس پڑے ہوے ہیں تو اس نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر اپنے فیملی ڈاکٹر کو فون کر دیا اور وہ پندرہ منٹ کے اندر حاضر ہو گیا۔ اس نے سب سے پہلے منگلا پرشاد کی نبض دیکھی پھر بلڈ پریشر چیک کرنے کے بعد ٹارچ کی روشنی میں آنکھوں کا معائنہ کرنے کے بعد اپنا فیصلہ سُنا دیا۔

''منگلا پرشاد جی کو شاید برین ہیمرج ہو گیا ہے، انھیں فوراً ایمس میں داخل کروا دیجیے تو بہتر ہوگا۔ میں ایمبولینس کے لیے فون کر دیتا ہوں۔ اتنا کہہ کر اس نے ایمبولینس کے لیے فون کر دیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد نیرج اور اس کی بیوی منگلا پرشاد کو ساتھ لے کر ایمس پہنچ گیے۔ نیرج کو ایمس کی بھیڑ بھاڑ بھی کچہری جیسی ہی محسوس ہو رہی تھی۔ ہر طرف سے آدمیوں کا سیلاب اُمڈا پڑ رہا تھا۔ وکلا کے پیچھے دوڑتے موکلوں کی مانند بیشتر مریضوں کے ساتھی اکسپرٹ ڈاکٹروں کی خوشامد میں لگے دکھائی دے رہے تھے۔ نیرج کے ڈراوَر نے لائن میں کھڑے ہو کر منگلا پرشاد کے نام سے ایک پرچہ بنوایا اور نیورولاجی والے کمرے میں جمع کر دیا۔ نیرج نے دیکھا کہ وہاں پہلے سے ہی تقریباً ڈیڑھ سو پرچے جمع تھے۔ پہلے سے جمع پرچوں کی تعداد اور والد کے مہلک مرض کے سبب بگڑتی حالت کو دیکھ کر وہ خاصا فکرمند نظر آ رہا تھا۔ ڈاکٹر کے کمرے کے دروازے پر تعینات چوکیدار صرف اُسی شخص کو اندر جانے کی اجازت دے رہا تھا جس کے نام کا اعلان مائک پر کر دیا جاتا۔ جب نیرج کو محسوس ہوا کہ اپنی باری کا انتظار اس کے والد کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے تو اُس نے اپنا شناختی کارڈ دروازے پر کھڑے چوکیدار کو دیتے ہوے کہا کہ براے مہربانی اِسے ڈاکٹر صاحب تک پہنچا دو تو وہ کارڈ لے کر اندر چلا گیا۔ دو منٹ کے اندر ہی چوکیدار نے واپس آ کر کہا کہ پروفیسر گُپتا نے آپ کو اندر بلایا ہے۔ ڈاکٹر کا نام سُن کر اُس کا دماغ ٹھنا اور اُسے تھوڑی سی گھبراہٹ بھی ہوئی مگر وہ اپنی بیوی کے ساتھ فوراً

اندر داخل ہو گیا۔ پروفیسر گپتا سے نظریں ملنے کے بعد شرمندگی سے بچنے کے لیے اس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں تو انھوں نے نرم لہجے میں کہا۔

''گھبرایئے مت وکیل صاحب۔ ہر چند کہ اس وقت تقریباً ڈیڑھ سو مریض میرے منتظر ہیں۔ ان سب کا بہتر علاج میری ذمہ داری ہے پھر بھی میں آپ کے والد کو ہی فوقیت دوں گا کیوں کہ ہم ڈاکٹر لوگ مریض کی تعداد سے گھبرانے کے بجائے ان کا علاج ضرورت اور فوقیت کے لحاظ سے کرتے ہیں۔ آپ کے والد غالباً نیم بیہوشی کی حالت میں ہوں گے اس لیے میں خود ہی ان کے پاس چلتا ہوں۔ انھیں اندر لانے کی ضرورت نہیں۔'' اور وہ نیرج کے ساتھ چل دیا۔ نیرج کی بیوی کبھی ڈاکٹر کو تو کبھی اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر پوری توجہ سے منگلا پرشاد کی جانچ کر رہا تھا جبکہ نیرج کبھی ڈاکٹر سے تو کبھی اپنی بیوی سے نگاہیں چرانے کی کوشش کرتا رہا۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ اُسے اس بات کا احساس ہوا تھا کہ اصل معنی میں بڑکپن اس ڈاکٹر میں ہے، مجھ میں نہیں۔

●

نیم پلیٹ

کسی بھی مذہب یا فرقے کا مبلغ اپنے فرقے والوں کو درس دیتے وقت یہ کبھی نہیں بتاتا کہ تمام مذاہب مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ ماموں کو ہمیشہ یہی یقین دلاتا ہے کہ 'ہم جس مذہب کے پیرو ہیں، وہی دنیا کا اعلیٰ ترین مذہب ہے۔ صرف اسی مذہب کی پیروی کرنے والے جنت کے مستحق ہیں۔ اگر بات یہیں تمام ہو جاتی تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ ستم بالائے ستم کہ ہر امام اپنے ماموں کو طرح طرح کے دلائل سے یہ بھی باور کراتا ہے کہ ہمارے مذہب کے علاوہ دنیا کے تمام مذاہب غلط اور بے بنیاد ہیں۔ ہر مذہب کے پیرو جہنمی ہیں۔ صرف اور صرف ہمارا مذہب ہی راست ہے اور یہی وہ واحد فرقہ ہے جو جنت میں جائے گا'۔ یہی باتیں ہر ماں اپنی اولاد کی گھٹی میں کچھ اس طرح پلا دیتی ہے جو مرتے دم تک دنیا کی سب سے بڑی حقیقت بن کر اس کے ذہن سے چپکی رہتی ہے۔ اسی کے زیر اثر اپنے مبلغ کو سب سے بڑا حق گو تصور کر کے بیشتر افراد مذہبی معاملات میں ہمیشہ ایک دوسرے کو غلط ثابت کرنے کی ناکام کوششوں میں لگے رہتے ہیں۔ اس کا یہی یقین نفاق کے ساتھ تنفر اور فرقہ واریت کو جنم دیتا ہے، جس کے نتیجے میں انسان جیسا قدرت کا شاہ کار، شیطنت کا ہدف بن جاتا ہے اور اکثر و بیشتر اسے اپنی جان تک سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اب تک انسانی ہاتھوں سے جتنی بھی انسانی جانیں تلف ہوئی ہیں، ان میں سے بیشتر بے قصور ہی کسی نہ کسی کی ہیکڑی کا شکار ہوے ہیں۔ ان حادثات میں زیادہ تر ۔ ے جا انسانی تمکنت اور مادیت کے ساتھ اسکے اجداد سے ورثے میں ملی اسی قسم کی غلط مذہبی تعلیم کا اہم رول ہوتا ہے جسے وہ دنیا کی واحد حقیقت تصور کرتا

ہے۔

ابھی کل کی بات ہے، ہمارے امن پسند شہر میں دنگا ہو گیا۔ اس ملک میں اصطلاحاً دنگا صرف اس فساد کو کہا جاتا ہے جو لڑائی جھگڑا ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہب کو بنیاد بنا کر ہوتا ہے۔ اس ملک کے باشندوں کی ایک خصلت یہ بھی ہے کہ یہاں کے اکثر عوام کے دلوں میں قہر خداوندی کا خوف نہیں۔ نہ یہ طغیانی سے ڈرتے ہیں نہ وبا سے، نہ زلزلے سے نہ ہی قحط سے۔ یہاں کا ہر شخص صحیح معنی میں اگر خوف زدہ رہتا ہے تو فرقہ وارانہ فساد سے۔ دنگوں میں اس کی خوف زدگی کا عالم یہ ہوتا ہے کہ اکثر دونوں فرقے ایک دوسرے کے خوف کے سبب بھی گھبراہٹ میں لڑ پڑتے ہیں، جسے افواہ خوب ہوا دیتی ہے اور اسے روئی کی آگ کے مانند آن کی آن میں سینہ بہ سینہ دور دور تک پھیلانے میں اہم ترین رول بھی ادا کرتی ہے۔ اس پر کسی کا قابو نہیں۔

اس شہر میں جو فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا اس کی وجہ بڑی مضحکہ خیز ہے۔ کسی ہندو کے کتے نے ایک مسلمان کی بکری کو نوچ لیا تھا۔ اس ہندو نے شرمندگی ظاہر کرنے کے بجائے رعب اور ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا تو بات تو تو، میں میں کی سرحد کو پار کرتے ہوئی گالی گلوج سے گزرتی ہوئی جب ہاتا پائی تک جا پہنچی تو وہاں خاصا مجمع لگ گیا۔ اس ملک میں چاہے جس چیز کی کمی ہو مگر تماش بینوں کی کمی کبھی نہیں رہی۔ ایک کتا بھی اگر کسی گاڑی کے نیچے آجائے تو حیرت انگیز طور پر، آن کی آن میں لاتعداد لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے انہماک کا عالم یہ ہوتا ہے کہ نہ کسی کو اپنی بغل میں دبا ہوا سبزی کا جھولا یاد رہتا ہے نہ ہی جیب میں پڑا دوا کا پرچہ۔ بہر حال، جس جگہ یہ سب چل رہا تھا وہیں نزدیک مسلم محلّہ بھی تھا جہاں سے خاصی تعداد میں مسلمان بھی اکٹھا ہو گیے تھے جبکہ جائے واردات ہندو محلّہ تھی۔ پھر ہندوؤں کی کثرت کا کیا کہنا۔ کتے والوں کو ہندو محلے کا غرّہ تھا تو بکری والے کو آناً فاناً میں جمع ہوئے اپنے 'بھائیوں' کی تعداد کا زعم۔ اس عالم میں کسی کے بھی پیچھے ہٹ جانے کا

مطلب تھا کہ اس کے مذہب اور فرقے کی عزت کو بٹا لگ جاتا۔ یہ بھلا کیسے گوارا تھا چنانچہ اب درمیان میں کتا رہ گیا تھا نہ بکری۔ دیکھتے دیکھتے سارا مجمع کتا نظر آنے لگا۔ ہر چہار سمت سے غرانے اور بھونکنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ہر شخص ایک دوسرے کو نوچنے بھنبھوڑنے لگا۔ اللہ اکبر اور ہر ہر مہادیو جیسے مقدس نعروں کے جوش، معصوم انسانی زندگیوں کے سودائی بن گیے۔ شہر کی گلیوں محلوں میں اب صرف بھیڑیا صفت کتے ہی چہار سمت پورے جوش وخروش کے ساتھ دندناتے پھر رہے تھے۔ کافی دیر تک چلی اس قتل و غارت کے بعد جب ان سب کا جوش کچھ ٹھنڈا پڑا تب کہیں جا کر پولس کی باری آئی۔ حالات جلد قابو میں کرنے کی غرض سے فوراً کرفیو نافذ ہونے کا حکم جاری کر دیا گیا تاکہ جلد از جلد امن بحال ہو سکے۔ کئی دنوں تک مسلسل چوبیس گھنٹوں کا کرفیو لگا رہا۔ ہر کس و ناکس اپنے گھروں میں مقید کر دیا گیا تھا مگر زیادہ ڈھیٹ قسم کے لوگ تنگ گلیوں کی آڑ میں باہر نکل کر دودھ، سبزی وغیرہ کا انتظام کر لیتے تھے۔ ان میں کبھی کبھار کوئی پولس کے ہتے چڑھ جاتا تو اسے دو چار ڈنڈے بھی کھانے پڑتے۔ پولس سے وارننگ پا کر چھوٹے لوگ، پولس والوں کا احسان مانتے، اپنے گھر کی طرف بھاگ کھڑے ہوتے۔ پولس والوں کے احسان کے تلے دبے ہوئے ان احسان گزیدہ لوگوں میں رشید میاں بھی تھے، جنھوں نے آج کے تازہ تجربات کے ساتھ اپنے پڑوسیوں کو ایک ایسی خبر سنائی کہ جس پر آسانی سے یقین کر سکنا مشکل تھا۔ وہ اپنے پڑوسی غفار بھائی سے کہہ رہا تھا۔

''ہم تھوڑی دیر پہیلے سڑک پر بیڑی لیوے گے رہن۔ ہُواں کا منجر دیکھ کے ہم ت دنگ رہ گین۔'' اس نے تعجب خیز انداز میں کہا۔

''ہُواں تو کا دیکھیو رسید بھائی؟'' اس نے رشید کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ہم دیکھِن کی کربھو کھالی ہمرے لون کے محلا میں لگا ہے۔ ہُواں ہندو محال

میں سب لون ارام ارام سے گھوم رہن ہیں۔ چھوٹ چھوٹ لڑیکا لون سڑک پر کر کٹ کھیل رہن ہیں اور پولس والے ارام سے ان کے دیکھ رہن ہیں۔ ان سے کچھ بولتے ناہیں ہَین۔ ای ت گلت بات ہے۔ ارے کرپھو ہے ت سب کے لیے ناہیں ت کوئی کے لیے ناہیں۔ ای ت مسلمان بھائی لوگن پر بڑا جُلم ہے بھائی۔'' وہ خاصا کبیدہ خاطر نظر آرہا تھا۔

''تورا سوچے کا تریکا گلت ہے رسید بھائی۔ پورا پولیس ڈپاٹ بُرا نئی نے بھائی۔ ہاں پولیس میں بھی دو چار لون جرور برے ہو سکے تن۔ ای کر کے پورے ڈِپاٹ کے گلت نہیں کہا جا سکے تے، سمجھیو نے؟ ای سمجھ لیو کی ایسی کوئی نو جگہا نئی نے جہاں دوئی چار لون کھراب نہ ہوئیں۔ سب برادری کے گلت ناہیں کہا جا سکتا۔ ایک ٹھے جروری بات اوُر وُسن لیو رسید بھائی۔ ای مُلک میں جتنا بھی کانون بچا ہے یہی پولیس ڈپاٹ بچائے ہے۔'' مگر رشید پر تو ایک قسم کا جنون سوار تھا، اس لیے اس نے غفار کی ایک نہ سنی۔

''ہم جائی لا لیس. پی. ساب کے پھون کرے۔ آ کھر اُون کے بھی ت مالُم ہوے کے چاہی کہ اون کی پولیس ہیاں کا کر رہی ہے۔'' اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

کرفیو کے دوران مسلمانوں کے مقید رہنے اور ہندوؤں کے آزاد گھومنے کی افواہ کو لے کر ایک مرتبہ ماحول میں پھر سے ہلچل پیدا ہوگئی۔ جو معاملہ تقریباً سرد ہو چلا تھا، اس میں پھر سے گرمی پیدا ہوگئی۔ اس موقع سے کئی ٹٹ پونجیے نیتاؤں کو اپنی نیتا گیری چمکانے کا موقع بھی ہاتھ آ گیا تھا اس لیے بات اتنی بڑھی کہ فریقین ایک مرتبہ پھر آمنے سامنے آ گیے۔ نعرے بازی اور پتھراو کے درمیان کسی بدمعاش نے دو تین فائر بھی کر دیئے۔ اس پتھراو میں عوام کے ساتھ کئی پولس والے بھی زخمی ہو گیے۔ جب معاملہ تھوڑا ٹھنڈا پڑا تب پولس کی جانب سے گھر گھر تلاشی شروع کر دی گئی۔ اس تلاشی کا اصل ہدف وہ محلّہ تھا جہاں سے فائرنگ ہوئی تھی۔ گھروں کی تلاشی کے نام پر ہی ہر کسی کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے

لگیں۔ کئی بار سوخ لوگوں نے بڑے بڑے نیتاؤں کو تلاشی رکوانے کی غرض سے فون بھی کیا مگر کسی نیتا سے بھی بات نہ ہوسکی۔ کوئی شہر سے باہر گیا ہوا تھا تو کوئی سخت علیل تھا۔

تلاشی کیا شروع ہوئی گویا قیامت صغرا آگئی۔ گھروں کے جتنے بھی مرد تھے ان لوگوں نے یا تو گھر چھوڑ کر راہ فرار اختیار کر لیا تھا یا کہیں چھپ رہے۔ جو بچ رہے، ان میں سے متعدد گرفتار ہوے۔ گھر گھر تلاشی کے سبب رشید خاصا خوف زدہ تھا۔ وہ اپنے گھر کی بالائی منزل والی کھڑکی کی جھری سے آنکھ لگائے مسلسل گلی کا نظارہ کر رہا تھا۔ پڑوسیوں کے گھروں سے لگاتار چیخ پکار اور توڑ پھوڑ کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ اسے قرآن شریف کی جتنی آیتیں یاد تھیں، وہ لگاتار ان کی تلاوت کیے جا رہا تھا۔ پولس والوں کا ایک غول اس کے دروازے پر بھی آ کر رکا۔ پولس والوں نے چند لمحے غور سے اس کے گھر کو دیکھا اور آپس میں کچھ گفتگو کرنے کے بعد وہ سب آگے بڑھ گیے تو رشید نے چین کا سانس لیا۔ اس محلے میں رشید کا گھر واحد تھا، جس کی تلاشی نہیں ہوئی تھی۔ سارا محلہ متحیر تھا۔

وقت ہر زخم کا سب سے کارگر مرہم ہوتا ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ بکری کا مالک یہ بھی بھول گیا کہ اس کی بکری کو کس کے کتے نے نوچا تھا۔ عوام کی مزاج پرسی اور ان سے ہمدردی جتانے کے لیے چند سیاسی پارٹیوں کے موقع پرست لیڈر گِدھوں کے مانند اس محلے پر منڈلانے لگے۔ کئی عدد امن کمیٹیوں کی تشکیل عمل میں آئی۔ ہر طرف ہندو مسلم ایکتا کے بینر اور پوسٹر چسپاں کیے جانے لگے۔ شہر کے درمیانی میدان میں ہندو مسلم ایکتا کے بینر تلے ایک بہت بڑا کل ہند مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا۔ امن پسند لوگوں کی ان کوششوں سے شہر کی کھوئی ہوئی رونق جلد ہی دوبارہ واپس آگئی۔ بظاہر ہر کسی کے دلوں سے کدورت جاتی رہی مگر محلے والوں کے ذہن میں آج بھی ایک سوال گُلبُلا رہا تھا کہ 'آخر رشید میاں کے گھر کی تلاشی کیوں نہیں ہوئی؟' اس سے جب بھی کوئی یہ سوال کرتا تو وہ کسی نہ کسی بہانے ٹال جاتا تھا مگر آج اس کے پڑوسی غفار نے جب اسے بہت زیادہ عاجز کر دیا

تو مجبوراً رشید کو اس راز سے پردہ اٹھانا ہی پڑا۔

''اب تو سے کا چھپائی ہو گھار بھیا۔ بات ای ہے نے کہ ہر برادری والا کھالی اپنی برادری والن کے پہچانتا ہے۔ ای کر کے ہم ایک ٹھے نام والی تکھتی بنوائے لیے۔ او ہے، جنوں بڑے بڑاو لوگن کے گھر کے درواجا پر لگائی جا تھے۔ اوپر ہم 'عبدالمتین انصاری..... ڈپٹی ایس. پی' لکھوائے کے اپنے گھر کے درواجا پر چپنائے دیئے۔ سمجھ گیو کہ ناہیں۔''

غفار متحیر سا ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا جب کہ رشید صرف مسکرا رہا تھا۔

●

رام راج

پرانا مقولہ ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے، اس لیے ہر انسان فطرتاً نئے پن کی تلاش میں رہتا ہے۔ نئے پن کی یہی جستجو انسان کو ترقی کی منازل تک لے جانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ اب تو نیا پن فیشن کی طرح ہر دل عزیز ہو گیا ہے۔ کپڑے لتے، گھر مکان، سجاوٹ وغیرہ تو در کنار، ہمارے ملک کی بہت سی سیاسی پارٹیاں بھی نئے پن کا مکھوٹا لگا کر عوام کو نئے طریقوں سے لبھا کر اپنی پارٹی کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان میں چند سیاسی پارٹیوں کو کامیابی ملتی ہے تو کبھی کبھار کوئی سیاسی پارٹی حیرت انگیز طور پر سدرۃ المنتہٰی تک بھی جا پہنچتی ہے۔ اس مرتبہ کے عام انتخابات سے ایک برس قبل ایک شخص کے کسی کارنامے کو میڈیا والوں نے کچھ اس طرح اُچھالتے ہوئے متعارف کرایا کہ وہ راتوں رات عوام کے دل و دماغ پر کچھ ایسا چھایا کہ اس کی شخصیت کے جادو کا اثر دن دونا رات چوگونا، ہوتا گیا۔ اس کی ایمانداری، شرافت اور ظلم، تشدد اور بربریت کے خلاف اقدام نے عوام پر ایسا جادو کیا کہ عام طور پر پورا ملک اور خاص طور سے غریب اور مزدور طبقہ اس کے نام کا دیوانا ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد اس کے نام اور تصویر سے آویزاں ٹی شرٹ تک بازاروں میں نیے فیشن کے نام پر فروخت ہونے لگیں۔ جب اس شخص کو یقین ہو گیا کہ پورے ملک کے عوام کے دلوں پر اس کی ایمانداری اور انسان دوستی کا سکہ جم چکا ہے تو موقع تاڑ کر اس نے اپنی ایک سیاسی پارٹی کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اُس کے اِس اعلان سے عوام یوں خوش تھے جیسے انھیں حقیقی معنی میں اپنا کوئی سچا ساتھی اور صحیح لیڈر مل گیا ہو۔ عوام کو یقین تھا کہ یہی شخص ملک میں 'رام راج'

قایم کرے گا۔اس کے برعکس اس شخص کی کارکردگی اور نام ونمود سے ملک کی تمام سیاسی پارٹیاں کچھ گھبرائی گھبرائی سی نظر آنے لگی تھیں۔تقریباً ہر بڑی پارٹی نے سوچ رکھا تھا کہ اس نوزائیدہ لیڈر کو اپنی پارٹی میں شامل کر کے اس کا پورا فائدہ اٹھایا جائے گا مگر اس کی اپنی پارٹی بن جانے کے بعد تمام سیاسی پارٹیاں قدرے فکرمند ہوگئی تھیں۔کئی سیاسی پارٹیوں نے اسے بڑے بڑے لالچ بھی دیے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔حقیقتاً اسے اپنی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہو چکا تھا چنانچہ جب انتخابات کی تاریخ کا اعلان ہوا تو اس نے اپنی نوتشکیل شدہ سیاسی پارٹی کے رجسٹریشن کے ساتھ امسال کے عام انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کردیا۔اپنے منیفیسٹو میں انتخاب کے بعد کامیابی کی صورت میں اس نے 'رام راج' لانے کا وعدہ بھی کیا تھا جس کے سبب عوام اس سے بہت خوش تھے۔اس شخص کا پورا نام شانتی داس تھا، جواب پورے ملک میں شانتی جی کے نام سے مشہور ہو چکا تھا۔اس اعلان کے ساتھ اس کے اِردگرد ٹکٹ مانگنے والوں کی بھی بے تحاشا بھیڑ جمع ہونا شروع ہوگئی۔ ویسے تو اس کے ساتھ کاریہ کرتاؤں کی بڑی ٹولی تھی مگر اسے کسی پر یقین نہیں تھا۔خاص کر پیسوں کے لین دین اور حساب کتاب کے معاملے میں، چنانچہ اس اہم کام کے لیے کافی غور و خوض کے بعد اچانک ایک نام اس کے ذہن میں گردش کرنے لگا۔اشرف.......... ہاں، میرے خیال سے اس اہم ترین کام کے لیے اشرف سے بہتر کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔ ایم.کام. پاس ہے اور شاید کسی بڑی کمپنی میں اکاؤنٹس افسر کے فرائض بھی انجام دے رہا ہے۔'مجھے اس سے فوراً رابطہ قایم کرنا چاہیے'۔

دوسرے روز شانتی، اشرف کو اطلاع دیئے بغیر اس سے ملاقات کی غرض سے اس کے گھر جا پہنچا۔آج اچانک شانتی سے مل کر اشرف کو دلی خوشی ہوئی تھی۔

''ارے شانتی تم.....ارے یار آج سورج پچھم سے کیسے نکل آیا۔سب خیریت تو ہے نہ؟ جو بھی ہو۔ مجھے تجھ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔اس لیے نہیں کہ تو اب عالمگیر

شخصیت کا مالک بن چکا ہے بلکہ اس لیے کہ تجھ سے ملاقات کو عرصہ گزر چکا تھا۔'' اشرف نے صاف گوئی سے کہا تو شانتی صرف مسکرا کر رہ گیا۔

''رسمی باتیں چھوڑو یار اشرف۔ میں آج تمھارے پاس ایک بہت ضروری کام سے آیا ہوں۔ ایک ایسا کام جو شاید .... میرے خیال سے تمھارے سوا اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔'' اس نے اپنے آنے کا مقصد بتایا تو اشرف نے مسکرا کر کہا۔

''واہ بیٹا، واہ۔ اگر تم میں سفلہ پن نہ ہوتا تو اتنی جلدی اتنی بڑی کامیابی کیونکر حاصل کر لیتے۔ تمھارا شمار تو اب ملک کے ان خوش قسمت لوگوں میں ہونے لگا ہے جن کے نام کو ان کی زندگی میں ہی بقائے دوام کی سند حاصل ہو جاتی ہے۔ خیر..... اپنے آنے کا مقصد بیان کرو۔ بغیر کسی ضرورت کے تو آئے نہ ہو گے۔ برا ماننے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ زمانہ لد گیا جب دوست صرف ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرنے ان کے گھر جایا کرتے تھے۔'' اس کا انداز فلسفیوں جیسا تھا۔

دونوں بچپن کے دوست اور کلاس فلو تھے مگر شانتی داس اب چونکہ اونچے مقام و مرتبے کا مالک بن چکا تھا اس لیے اسے آج اشرف کی زیادہ بے تکلفی کچھ گراں گزر رہی تھی مگر اس نے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا، صرف مسکرا کر کہا۔

''دیکھ یار اشرف، بچپن سے آج تک تو نے ہر گاڑھے وقت میں میرا ساتھ پوری ایمانداری سے دیا ہے، اسی امید پر میں آج تیرے پاس آیا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تو آج بھی مجھے مایوس ہرگز نہیں کرے گا......! میری پارٹی کی ساری خبریں تو تجھے اخبار اور ٹی.وی. سے مل ہی جاتی ہوں گی۔ تجھے اس بات کا اندازہ بھی ہو گیا ہوگا کہ مجھ پر کام کا بوجھ کتنا بڑھ چکا ہے۔ مجھے پیسوں کے معاملے میں کسی پر اعتبار نہیں ہے اس لیے میری خواہش ہے کہ تو ہی میری پارٹی کا حساب کتاب دیکھے۔ پارٹی فنڈ میں ڈونیشن کے نام پر بے حساب پیسے آ رہے ہیں۔ کل تو ایک بڑے سیٹھ نے مجھے اپنی بلڈنگ ہی پارٹی آفس

کے لیے دان میں دے دی۔ میں چاہتا ہوں کہ لین دین کا سارا حساب کتاب صرف تو دیکھے۔تن تنہا۔کیا تو میرے لیے اتنا کرے گا؟''اس نے ایک سانس میں اپنی آمد کا مقصد بیان کر دیا تو اشرف نے کہا۔

''تجھے تو معلوم ہے یار کہ میری بھی کچھ گھریلو ذمہ داریاں ہیں اور میں ایک بڑی کمپنی میں اکاؤنٹس افسر ہوں۔ ساٹھ ہزار روپے ماہوار تنخواہ کے علاوہ کمپنی اپنی طرف سے دوسری سہولتیں بھی فراہم کرتی ہے.....!'' شانتی نے بیچ میں ہی اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''تیری خدمات کے عوض پارٹی تجھے ایک لاکھ روپے ماہوار تنخواہ کے علاوہ وہ تمام سہولتیں بھی فراہم کرے گی جو تیری کمپنی تجھے دے رہی ہے۔اور اگر میری پارٹی کی گورمنٹ بن گئی تو میں تجھے اپنی گورمنٹ میں من چاہی منسٹری میں جو عہدا تو چاہے گا، وہ بھی دونگا۔اسے پارٹی کی طرف سے بونس سمجھ لینا۔''اس نے مسکرا کر کہا۔

''جس طرح آج تک اشرف نے ہر موقع پر تیری مدد کی ہے، اِس موقع پر بھی تیرا ساتھ ضرور دے گا۔ ویسے بچپن سے آج تک تو کبھی بھی اپنے وعدے کا پکا نہیں رہا۔نیتا گیری تو تجھ میں بچپن سے کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔''اشرف نے مذاق کیا تو دونوں ہنس پڑے اور چند رسمی گفتگو کے بعد اشرف نے اس کا کام کل سے شروع کرنے کے وعدے کے ساتھ اسے وداع کر دیا۔

پارٹی کا کام اتنا زیادہ تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اشرف کو اپنی کمپنی سے مستعفی ہونا پڑا۔ وہ پوری تندہی کے ساتھ اپنے دوست کی پارٹی کے کام میں لگ گیا۔اس سلسلے میں اس نے شانتی سے کچھ شرائط بھی منوالی تھیں۔

''دیکھ شانتی، تجھے تو معلوم ہی ہے کہ میں اپنے کام میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتا چنانچہ اس سلسلے میں تجھ سے ایک بات صاف طور پر بتا دینا چاہتا ہوں۔ پارٹی کی

طرف سے ٹکٹ کس شخص کو کتنے چندے کے عوض دینا ہوگا، اس کا اول اور آخر فیصلہ میرا ہوگا۔ چندے کے معاملے میں مجھے تیری بھی مداخلت قابل قبول نہیں ہوگی اور اگر تیری پارٹی نے سرکار بنائی تو تمام ایم.ایل.اے. حضرات میں منسٹر بھی اُسی کو بنایا جاے گا جو زیادہ سے زیادہ چندہ دے گا......وغیرہ۔ یعنی اس سلسلے میں بھی چندے کی رقم کا فیصلہ میں ہی کروں گا، تو نہیں۔ کیا یہ شرط تجھے منظور ہے؟'' اشرف نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوے پوچھا۔

''ہاں یار، چونکہ تیرا یہ عمل بھی پارٹی کے مفاد سے وابستہ ہے اس لیے بھلا مجھے کیوں اعتراض ہونے لگا۔ چندے کی رقم کا فیصلہ خالص تیرا ہوگا۔'' اور اشرف نے اپنے طریقے سے کام کا آغاز کر دیا۔

دیکھتے دیکھتے پارٹی کے لیے چندے کی رقم کروڑوں تک پہنچ گئی۔ جب ٹکٹ بٹنے کی باری آئی تو اشرف نے ٹکٹ چاہنے والوں سے اپنے طور پر موٹی موٹی منھ مانگی رقمیں وصول کیں۔ شانتی کا کوئی قریبی بھی جب اس سے اشرف کی شکایت کرتا تو شانتی صاف لفظوں میں کہہ دیتا تھا کہ ''یہ تو پارٹی کی فلاح کے لیے ہے اور پھر چندے کا یہ اصول اشرف کا بنایا ہوا ہے جس میں مَیں کسی قیمت پر بھی مداخلت نہیں کر سکتا۔'' چنانچہ ہوتا وہی جو اشرف چاہتا۔ پھر چندے کے معاملے میں شانتی اعتراض ہوتا بھی کیوں۔ سارے اصول تو اسی کے حق میں تھے۔ صرف پیسے جمع کر کے اسے شانتی کے حوالے کر دینا ہی اشرف کی ذمہ داری تھی۔ اخراجات سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ کام شانتی اپنی مرضی سے کرتا اور حساب اشرف کو لکھوا دیتا تھا۔ اشرف کو تو صرف اپنی طے شدہ تنخواہ سے مطلب تھا۔

ٹکٹ کے عوض ملے پیسوں سے اب پارٹی کے خزانے میں ہزاروں کروڑ روپے کی رقم بغیر جدوجہد کے جمع ہو چکی تھی۔ الکشن کے زمانے میں بڑے پیمانے پر پارٹی

پبلیسٹی کی گئی۔اس الکشن کا جونتیجہ آیا وہ عوام اور پارٹی کی توقع کے مطابق ہی تھا۔پورے صوبے میں پارٹی کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی تھی۔کئی پرانی اور نامی گرامی پارٹیوں کے بہت سے نیتا اپنی ضمانت تک نہیں بچا سکے تھے۔پورے صوبے میں ہر طرف شانتی کی پارٹی کے چرچے تھے۔شانتی اور اس کے کامیاب لیڈروں کے حلف کے بعد اب شانتی کے سامنے ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ کس شخص کو کون سی منسٹری دے۔جب اس معاملے میں رسا کشی،چپقلش کی حد تک پہنچ گئی تو وعدے کے مطابق یہ کام بھی شانتی نے اشرف کے ہی سپرد کر دیا۔اشرف کا وہی پرانا اصول کہ جو جتنا زیادہ چندہ دے گا اسے اتنی اچھی منسٹری عطا کی جائے گی۔شانتی نے اس موقع پر بھی نہایت خوبصورتی سے اپنا دامن بچاتے ہوئے اپنی پارٹی کے ہر ممبر سے یہی کہا کہ ''بھئی، یہ حق بھی میں نے اشرف کو ہی دے دیا ہے۔ایک اکیلا میں کتنے کام دیکھوں گا۔اشرف چونکہ بااصول اور ایماندار ہے اس لیے میں اس کے کسی فیصلے میں مداخلت نہیں کروں گا۔''

منسٹری کے بٹوارے میں بھی اشرف نے ایک بار پھر سے شانتی کی تجوری اسقدر بھر دی کہ آئندہ الکشن کے اخراجات کا بھی انتظام ازخود ہو گیا تھا۔

ہنسی خوشی اور کامیابی سے اپنی تمام ذمہ داریاں نباہنے کے بعد ایک روز اشرف نے صوبے کے وزیراعلیٰ شانتی داس سے کھلے لفظوں میں کہہ دیا۔

''دیکھ بھائی، میرے خیال سے میں تیری امید کے مطابق اپنی تمام ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو چکا ہوں اس لیے گزشتہ ماہ کی تنخواہ کے ساتھ مجھے اجازت بھی دو۔۔۔'' شانتی کو اشرف کی تو تڑاک بری تو لگتی تھی مگر وہ کرتا بھی کیا،اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔وزیراعلیٰ بن جانے کے بعد عہدے کی تمکنت اس پر اس قدر غالب آ چکی تھی کہ وہ اب اشرف کو منٹ بھر کے لیے برداشت کرنے کو تیار نہیں تھا۔اس کے ذہن میں اب صرف ایک ہی خلش باقی رہ گئی تھی کہ اشرف کو کسی طرح نگاہوں سے ہمیشہ کے لیے

دور کر دیا جائے۔ تھوڑے عرصہ تک غور کرنے کے بعد اس نے اشرف سے کہا۔

''اس میں تو کوئی شک نہیں یار کہ تو نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا۔ اب تیرے ساتھ کچھ کرنے کی میری باری ہے، جیسا کہ میں نے وعدہ کیا تھا۔ ویسے بھی تو میری خاطر اپنی نوکری تو چھوڑ ہی چکا ہے.......! میری کسی بھی منسٹری کا جو بھی ڈپارٹمنٹ تجھے پسند ہو، میں تجھے اس کا وائس چیرمین بنا دیتا ہوں۔ تو خود ہی بتا کہ کس ڈپارٹمنٹ کا وائس چیرمین بننا پسند کرے گا۔'' اتنا کہہ کر وہ اشرف کے فیصلے کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً دو منٹ تک غور کرنے کے بعد اشرف نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں تو نے وعدہ تو کیا تھا۔ ٹھیک ہے، اگر تو مجھے کسی شعبے کا وائس چیرمین بنانا ہی چاہتا ہے تو جیسی تیری مرضی۔ اب پھر سے نوکری کے لیے کہاں دربدر ٹھوکریں کھاؤ نگا۔ جیسا تو مناسب سمجھ۔'' اتنا کہہ کر وہ شانتی کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

''میرے خیال سے تمھارے لیے کھادی اور گرامودیوگ منترالے اچھا رہے گا۔ کیوں، کیا خیال ہے؟'' اس نے اشرف کا خیال جاننا چاہا تو اس نے مسکراتے ہوئے حامی بھرلی تو شانتی نے کہا۔

''ٹھیک ہے، تیری وائس چیرمین شِپ پکی.......اس عہدے کے لیے چندے کی جو رقم بنتی ہو، اُسے پارٹی کے خزانے میں جمع کروا دینا۔ اور سُن میرے بھائی، چندے کا اصول تیرا ہی بنایا ہوا ہے۔ میں نے اب تک تیرے اس اصول کی پاسداری کی ہے اور آئندہ کبھی بھی تیرے اس اصول سے چشم پوشی ہرگز نہیں کروں گا۔ ہاں، میں تجھے اپنی طرف سے پچاس لاکھ روپے کی خاص رعایت ضرور دوں گا۔ آخر تو میرا دوست ہے نا۔ اب یہ تو نہیں کہے گا نہ کہ تو بچپن سے آج تک کبھی اپنے وعدے کا پکا نہیں رہا۔''

شادی کے لڈّو

کہاوت مشہور ہے 'شادی وہ لڈو ہے جسے کھائے تو پچھتائے، نہ کھائے تو پچھتائے'۔ یعنی سانپ کے منھ کی چھچھوندر۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر ایسے لوگوں کو کیا کہا جائے جو اِس لڈو کی تُرشی سے واقفیت کے باوجود اِسے دوبارہ زہر مار کرنے کے لیے باولے رہتے ہیں۔ شاید اسی لیے کہ اِس لڈو کی ترشی، زندگی کی تلخی مِٹانے میں بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ اب رام لگن کو ہی لے لیجیے۔ لمبی چوڑی جائداد اور مال ومتاع کے باوجود بیوی کے معاملے میں حد درجہ بدقسمت تھا بیچارہ۔ اس کا کوئی قریبی رشتہ دار اور خیر خواہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کی شادی تقریباً بتّیس برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ ابھی اس کی شادی کو چھ ماہ ہی گزرے تھے کہ اس کی خوبصوت اور فرماں بردار بیوی اللہ میاں کو پیاری ہوگئی۔ رام لگن کے نزدیک اسے رودھوکر صبر کر لینے کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ ایک سال تو فوت شدہ بیوی کے اظہارِ غم اور طرح طرح کی سماجی رسوم کی ہی نذر ہو گیے۔ وہ بیچارہ پھر سے لنڈورا گھومنے لگا مگر آخر کب تک؟ اب، جبکہ اسے پھر سے شادی کے لڈو کھانے کا چسکا لگا تو ہر ملنے جلنے والے سے دوبارہ شادی کی خواہش ظاہر کرنے لگا۔ رام لگن کی تنہائی اس کی زندگی کا ایک ایسا مسئلہ تھی جس کے لیے وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے ملنے جلنے والوں میں چند ایسے ذہین اور چالو قسم کے لوگ بھی تھے جو ایسے حالات میں اپنا الو سیدھا کرنا خوب جانتے تھے۔ ایسے لوگوں نے اس کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ اس کے ملنے والوں میں زیادہ سے زیادہ لوگ اس کی خاطر طرح طرح کے من گھڑت رشتے لیے روز اس کے یہاں پہنچنے لگے۔ دوبارہ شادی کی امید میں وہ دوستوں کی خوب آؤبھگت کرتا مگر

ہر رشتے کی بات انجام تک پہنچنے سے قبل ہی کسی نہ کسی بہانے منقطع ہو جاتی تھی۔ مثلاً لڑکی والے دوہاجو سے شادی نہیں کریں گے یا لڑکی کا باپ اپنی لڑکی کسی ایسے گھر میں نہیں دینا چاہتا جہاں کوئی بزرگ یا سرپرست نہ ہو۔ آخر کار تھک ہار کر رام لگن نے اپنی شادی کے واسطے طلاق شدہ یا بیوہ کے لیے ہی حامی بھر لی تھی مگر کافی تگ و دو کے بعد اس میں بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ زندگی بدستور چلتی رہی اور دوست اس کے یہاں روز دعوتیں اڑاتے رہے کیوں کہ اسے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی لڑکی والا کبھی نہ کبھی ان دوستوں کے توسط سے ہی راضی ہوگا۔ رام لگن کا یہ اندازہ اس روز صحیح ثابت ہوا جس روز اس کے ایک دوست دُلارے نے اس کی شادی کے سلسلے میں اسے ایک ناقابل یقین خبر سُنائی۔

''سنو رام لگن، آج میں تمھاری شادی کے لیے ایک ایسا رشتہ لایا ہوں جسے سن کر شاید تمھیں یقین نہ ہو مگر خبر ایک دم پکّی ہے۔ آخر مَیں تمھارا دوست ہوں......! اگر لڑکی کی ذات تمھارے مقابلے کمتر بھی ہے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ لڑکی کنواری ہے اور عمر بھی چودہ پندرہ سے زیادہ ہرگز نہیں جبکہ تمھاری عمر تو......! خیر چھوڑو۔'' دلارے اتنا کہہ کر چپ ہو گیا تو رام لگن نے دریافت کیا۔

''یہ تو بتاؤ کہ وہ لڑکی ہے کون اور اس کے ماں باپ......؟''

''نہایت غریب لوگ ہیں۔ کرائے کی ایک گندی سی کوٹھری میں رہتے ہیں۔ بیچاری کی نہ تو ماں ہے اور نہ ہی باپ۔ دونوں مر چکے ہیں۔ صرف ایک سوتیلا بھائی اور بھابی ہیں، جن کے ساتھ وہ رہتی ہے۔ اس کے بھائی کا نام، ہے تو کیدار ناتھ مگر عام طور پر لوگ اسے کیدارو کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ وہ رکشا چلاتا ہے۔ لڑکی میرے پڑوس میں جھاڑو بُہارو کر کے خود بھی تھوڑا بہت کما لیتی ہے۔ کیدارو کی بیوی نے کل لڑکی دکھانے کی پیشکش کی تو میں نے ہی انکار کر دیا۔ ارے یار ان کی تو اتنی بھی حیثیت نہیں ہے کہ کسی کو بٹھا کر ایک گلاس پانی پیش کر سکیں۔ بلاوجہ ان لوگوں کو شرمندہ کرنے سے کیا فائدہ۔ لڑکی روز

میرے پڑوس میں جھاڑو برتن کرنے آتی ہے۔کل صبح تم میرے گھر چلے آنا، وہیں سے تمھیں لڑکی دکھادوں گا۔'' دلارے کی اس اطلاع پر رام لگن کا دل خوشی سے بلیوں اُچھلنے لگا مگر اس نے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

''ارے یار، مجھے اس کی ذات برادری یا غربت سے کیا لینا دینا۔ میں پوری طرح تیار ہوں۔ میری طرف سے ہاں سمجھو۔'' اپنی زن گزیدگی کا اظہار اس نے بڑی عجلت میں کیا اور آنے والے کل کا انتظار شدت سے کرنے لگا۔ آنے والے کل کے بارے میں سوچ سوچ کر رام لگن، دل ہی دل میں خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ خوشی کے احساس نے اسے تمام رات ٹھیک سے سونے تک نہیں دیا تھا۔

ویسے تو رام لگن کبھی صبح نو بجے سے قبل سو کر نہیں اٹھتا تھا مگر آج صبح چھ بجے ہی اٹھ بیٹھا تھا۔ وہ جلد از جلد تیار ہو کر دلارے کے گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ 'لڑکی کام کرنے آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ صبح پانچ بجے ہی آجاتی ہوگی اور زیادہ سے زیادہ آٹھ بجے تک کام کاج ختم کر کے اپنے گھر چلی جاتی ہوگی، اس لیے مجھے دلارے کے گھر تڑکے ہی پہنچ جانا چاہیے۔' یہی سب سوچتا ہوا جب وہ اپنے دوست، دُلارے کے گھر پہنچا تو صبح کے سات بج چکے تھے اور دلارے ابھی سو رہا تھا۔ رام لگن نے اسے جگایا تو وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا اور اسے 'جے رام جی کی' کہنے کے بعد وقت دریافت کیا۔

''کتنا بجا ہے؟''

''سوا سات بج چکے ہیں اور تم ابھی تک سو رہے ہو۔'' رام لگن نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں یار، آج سو کر اٹھنے میں ذرا دیر ہوگئی مگر تم ایک دم صحیح وقت پر پہنچے ہو۔'' اس نے مسکرا کر کہا تو رام لگن بھی ہنس دیا۔ دلارے نے منھ پر پانی کا چھینٹا دیا اور رام لگن کو لے کر سیدھا اپنے گھر کے برامدے میں آگیا۔ اس جگہ سے پڑوسی کے گھر کا آنگن صاف

نظر آتا تھا مگر وہ لڑکی آنگن میں نظر نہ آئی۔ شاید برتن وغیرہ دھو چکی تھی۔ وہ رام لگن کو برامدے سے واپس لے کر ایک کمرے میں آیا اور دونوں ایک کھڑکی کے پاس کھڑے ہو گیے۔ اس کھڑکی سے پڑوسی کے گھر کا دالان صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ لڑکی دالان کے فرش پوچھا لگا رہی تھی۔ اس کی پشت ان دونوں کی طرف تھی۔ دونوں اس کے اپنی طرف مڑنے کا انتظار کرنے لگے لیکن وہ پوچھا لگا کر اِدھر مُڑے بغیر ہی اندرونی دروازے سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ پھر بھی رام لگن، ایک ٹک اُدھر ہی دیکھے جا رہا تھا۔ اُکتاہٹ دور کرنے کے لیے اس نے کہا۔

''دیکھنے میں تو اچھی لگ رہی ہے یار دلارے۔''

''ارے واہ یار......، مگر تم نے اسے اب تک دیکھا ہی کہاں؟'' دلارے نے ہنس کر کہا۔

''پیچھے سے تو دیکھا ہے۔ رنگ ایک دم گورا ہے جبکہ اس برادری والے زیادہ تر کالے ہی ہوتے ہیں اور عمر بھی بہت کم لگ رہی ہے۔'' اس نے خوشی کا اظہار کیا۔

''ہاں ہاں، بِنا ہرّے پھٹکری آسانی سے ایک غریب لڑکی مل رہی ہے تو اب ذات برادری یاد آنے لگی۔ اور مزدور پیشہ بھی تو ہیں وہ لوگ۔ اگر تمھاری عزت کو بٹا لگتا ہو تو صاف صاف کہہ دو۔ کوئی زبردستی تو ہے نہیں۔ اگر تمھیں اعتراض ہو تو بات کو یہیں ختم کرو۔ دنیا میں لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ اسے جانے دو، کوئی دوسری اونچی برادری والی لڑکی دیکھتے ہیں۔'' دلارے نے کہا تو رام لگن جلدی سے بول پڑا۔

''نہیں، نہیں بھائی۔ میں نے انکار تھوڑے ہی نہ کیا ہے۔ بس ایک جھلک سامنے سے بھی دیکھ لوں......'' اس نے جلدی سے کہا۔

''تا کہ کوئی نقص نکال سکو؟'' دلارے نے طنز کیا۔

''ارے نہیں یار۔ تم تو بلا وجہ میری کھنچائی کرنے لگے۔'' رام لگن نے اتنا ہی کہا

تھا کہ وہ پھر دکھائی دی تو وہ اسے غور سے دیکھنے لگا مگر یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چل سکا کیونکہ وہ صحن تک آ کر پھر واپس کمرے میں چلی گئی تھی۔

''لڑکی تو بہت سُندر ہے یار۔ اتنی گوری، کمسن اور جاذب نظر ہے کہ میرا تو دل خوش ہو گیا۔ مجھے منظور ہے۔'' رام لگن نے چہک کر کہا تو دلارے نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، کسی دن کیدارو سے ملاقات ہو گی تو بات چلاؤ نگا۔'' اس کے انداز میں ذرا لاپروائی تھی۔

''ارے نہیں یار۔ میرے خیال سے ان معاملات میں زیادہ دیر کرنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ میری مانو تو اس کے گھر والوں سے آج ہی بات کر کے فائنل کر دو اور جتنی جلدی ممکن ہو......!'' رام لگن کی عجلت کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے دلارے نے کہا۔

''دیکھو رام لگن، وہ لوگ تمھارے جیسے پیسے والے تو ہیں نہیں۔ وہ سب بہت غریب ہیں یار۔ ارے ان کی تو اتنی بھی حیثیت نہیں ہے کہ سو پچاس براتیوں کو کھلا بھی سکیں، پھر پوری شادی کا انتظام.........! تمھیں تھوڑا رُکنا ہوگا۔ ذرا صبر سے کام لو۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔'' اس کا انداز ٹالنے جیسا محسوس کر کے رام لگن نے تھوری دیر تک غور کرنے کے بعد پھر کہا۔

''ارے یار دلارے، تم میری طرف سے بھی تو سوچو۔ کتنی تگ و دو کے بعد ایک اتنا اچھا رشتہ ہاتھ لگا ہے۔ لڑکی مجھے بہت پسند ہے۔ اگر یہ رشتہ ہاتھ سے نکل گیا تو......! مجھے لڑکی والوں کی مالی حیثیت کا اندازہ بخوبی ہو چکا ہے۔ تم تو لڑکی کے بھائی کے دوست ہو۔ ایسا کرو کہ اس کے بھائی سے آج ہی ملو اور اگر وہ شادی کا انتظام نہ کر سکنے کی بنا پر یہ شادی ٹالنا چاہے تو اسے ایسا ہرگز مت کرنے دینا۔ کہہ دینا کہ وہ لوگ بہت کم براتی لائیں گے، صرف پانچ آدمی۔ تھوڑے بہت وہ اپنی برادری والوں کو بلالیں......سب کے

کھانے پینے کا انتظام میں کروں گا۔ میں تمھیں آج ہی...... پچاس ہزار روپے دے دوں گا جسے تم لڑکی کے بھائی کو، شادی کے انتظام کے لیے دے دینا۔ میرے خیال سے اس کے بعد شادی ٹالنے کی کوئی گنجائش نہیں رہ جائے گی۔'' رام لگن نے خیال ظاہر کیا۔

''ٹھیک ہے یار، تو بھی کیا یاد کرے گا۔ میں آج شام ہی کیدارو سے مل کر اسی ہفتے شادی کا انتظام کروا دیتا ہوں۔ اور ہاں، پھر تجھے بھی تو گہنے، کپڑے وغیرہ لینے ہوں گے...... چڑھائے جاتے ہیں بھائی۔'' دلارے نے اسے یاد دلایا۔

''ہاں، ہاں تو نے خوب یاد دلایا۔ لڑکی کے گھر سے واپسی کے بعد میرے گھر آجانا۔ میں وہیں پر تیرا انتظار کروں گا۔ تجھے ہی میرے ساتھ گہنے، کپڑے وغیرہ بھی خریدنے چلنا ہوگا۔'' اور دلارے نے حامی بھر لی۔

وعدے کے مطابق دلارے ٹھیک سات بجے رام لگن کے گھر پہنچ گیا۔ وہ تیار بیٹھا اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ دلارے نے آتے ہی رام لگن کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ لڑکی کا بھائی اسی ہفتہ شادی کرنے کے لیے راضی ہو گیا ہے اور دونوں خوشی خوشی شادی کی خریداری کرنے کے لیے بازار کی طرف نکل پڑے۔

شادی کیا، لڑکی والوں کو اپنی غربت اور رام لگن کو اپنی بڑھتی عمر اور دوسری شادی کی وجہ سے صرف فرض ہی تو ادا کرنا تھا۔ تقریباً تین گھنٹوں کے اندر اندر بیاہ برات، کھانا پینا اور رخصتی، گو کہ سب کچھ راضی بہ رضا انجام پا گیے۔ اپنی نئی نویلی، خوبصورت اور کمسن دلہن کے خیال سے رام لگن خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ آج اس کی سہاگ رات تھی۔ منھ دکھائی کے لیے اس نے ایک جوڑی قیمتی کنگن خریدا تھا، جس کے بارے میں اس نے سوائے دلارے کے اور کسی کو نہیں بتایا تھا۔ رات کے گیارہ بجتے بجتے رام لگن کے سارے ساتھی اسے نئی دلہن کی مبارک باد دے کر واپس ہو لیے۔ سب سے اخیر میں اس سے رخصت کے لیے دلارے اس کے پاس آیا۔

''تمھاری دلی مُرادتو آج پوری ہوگئی رام لگن۔ تمھیں بہت بہت مبارک ہو۔ اب مجھے بھی اجازت دو۔ رات زیادہ ہو رہی ہے۔ دلہن بھی تنہا بیٹھی شدت سے تمھارا انتظار کر رہی ہوگی۔'' دلارے اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ ایک اُنیس بیس برس کا لڑکا بڑی تیزی سے سائکل چلاتا ہوا آیا اور ان کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔ دلارے اسے پہچانتا تھا۔ وہ بھی لڑکی کا ہی کوئی رشتہ دار تھا۔ اس نے ذرا گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیدارو چاچا کی طبیعت اچانک بہت خراب ہوگئی ہے۔ اس کے پیٹ میں پھر سے تیز درد اٹھا ہے۔ محلے کے دو تین لوگ اسے لے کر ہسپتال گیے ہیں۔ یہی بتانے آیا ہوں۔'' اس نے رک رک کر کہا۔

''مگر سالے صاحب کو ہُوا کیا؟ ایک گھنٹے پہلے تک تو ایکدم ٹھیک ٹھاک تھے، یہ اچانک.....!'' رام لگن نے دریافت کیا تو دلارے بول پڑا۔

''ارے ہونا کیا ہے یار۔ وہی درد کا دورا پڑا ہوگا۔ سروا مانتا ہی نہیں۔ ڈاکٹر کے منع کرنے کے باوجود، جب بھی موقع ملتا ہے، پی لیتا ہے۔ لیورا یکدم چوپٹ ہو چکا ہے۔ آج بھی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی مگر جب مفت کی مل گئی تو چڑھا گیا ہوگا.....! ایسا ہے رام لگن کہ ایسے حالات میں اسے دیکھنے تمھیں بھی جانا چاہیے۔ ویسے شادی بیاہ کا گھر ہے، اگر تم نہ بھی جا سکو تو کل ہسپتال جا کر اسے ضرور دیکھ لینا مگر بھابی جی کو فوراً بھیج دو۔ میری تو یہی صلاح ہے۔ ویسے جیسا تم مناسب سمجھو۔'' دلارے نے کہا تو چند منٹوں تک وہ کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

''لیکن یار، آج میری سہاگ رات......! خیر، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں اُسے ابھی مانکے بھیج دیتا ہوں۔ میں کل چلا جاؤنگا۔'' اتنا کہہ کر وہ جیسے ہی دو قدم آگے بڑھا تھا کہ دلارے نے اسے ٹوکا۔

''ایسا کرو رام لگن کہ تم منھ دکھائی کی رسم پوری کر لو تاکہ وہ بھی خوش ہو جائے اور

تمھیں بھی کچھ سکون مل جائے۔اس کے بعد اسے مائکے بھیج دینا۔یہی لڑکا پہنچادے گا اور تم کل خود ہسپتال جا کر سالے صاحب کو دیکھ بھی لینا اور بھابی جی کو اپنے ساتھ ہی لیتے بھی آنا۔'' رام لگن کو اس کی صلاح پسند آئی اور وہ دلہن کے کمرے کی طرف چل دیا۔اس لڑکی کی ایک جھلک تو وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔آج دلہن کے روپ میں وہ قیامت ہی لگ رہی تھی۔اسے اتنی جلدی چھوڑنے کو اس کا دل قطعی نہیں چاہ رہا تھا مگر مجبوری تھی۔جب اس نے دلہن کو اس کے بھائی کی بیماری سے آگاہ کیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور فوراً گھر جانے کی خواہش ظاہر کی تو رام لگن نے اسے اجازت دے دی۔

دروازے پر ہو رہی تیز دستک سے رام لگن کی آنکھیں کھل گئیں۔اس کی نظر سامنے ٹنگی ہوئی دیوار گھڑی پر پڑی۔صبح کے آٹھ بجے تھے۔''پتہ نہیں کون اتنی صبح آمرا؟'' وہ بڑبڑاتا ہوا دروازہ کھولنے کے لیے اٹھ بیٹھا۔رات تقریباً دو بجے سویا تھا چنانچہ جلد اٹھنا اسے بہت برا لگ رہا تھا۔اس نے دروازہ کھولا تو سامنے اپنے دوست دلارے کو کھڑا دیکھا۔

''جے رام جی کی دُلارے بھیا۔اتنے سویرے سویرے کیسے آنا ہوا۔سب کچھ ٹھیک ٹھاک تو ہے نہ؟'' اس نے رسماً دریافت کیا تو دلارے نے اندر آکر دروازہ بند کر لیا اور رام لگن کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آیا۔

''رام رام......! کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے یار۔کل رات بڑا گڑبڑ ہو گیا۔کسی سالے نے......تمہارا ہی کوئی دشمن رہا ہوگا، پولس میں تمہارے خلاف رپٹ لکھوادی ہے کہ ٹھاکر رام لگن سنگھ نے ایک نابالغ اور شڈول کاسٹ کی لڑکی کے غریب بھائی کو شراب وراب پلا کر اس کی بہن کو پچاس ہزار روپے میں خرید لیا ہے۔تم پر اس کے بھائی کو ڈرانے دھمکانے کا الزام ہے۔داروغا نے تفتیش کے لیے دو سپاہیوں کو بھیجا تھا مگر چونکہ لڑکی کا بھائی ہسپتال میں بھرتی ہے اس لیے اس سے ملاقات نہیں ہو سکی مگر آج وہ......!'' یہ خبر سن کر رام

لگن کے پیروں کے نیچے سے زمین ہی نکل گئی۔ اُسے غصہ بھی آ رہا تھا۔ کیدارو پر، پولس پر، اپنے نادیدہ چغل خور دشمن پر اور اپنے نصیب پر بھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان حالات میں اسے فی الحال کیا کرنا چاہیے۔ اس کے منھ سے غیر ارادی طور پر صرف اتنا ہی نکل سکا۔

''نہیں چھوڑوں گا سالے کو۔'' وہ غصے کی شدت سے کانپ رہا تھا۔

''تم کیا کرلو گے ان لوگوں کا؟ ابھی کل ہی شادی ہوئی ہے۔ لڑکی نابالغ اور شڈول کاسٹ کی ہے جبکہ تم اونچی ذات والے، کیا اس میں کچھ غلط ہے؟ اچھی طرح سے سوچ لو......! سرکار میں سنوائی تو اسی کی ہوگی۔ تمھاری کون سنے گا؟ میں کیدارو سے بھی مل چکا ہوں۔ ارے وہ تو خود تمھارے خلاف رپٹ لکھوانے جا رہا تھا، دوسروں کے بہکاوے اور پیسوں کے لالچ میں۔ فی الحال تو اسے میں نے سمجھا بجھا کر کسی طرح روک لیا ہے مگر لگتا نہیں کہ وہ اتنی آسانی سے خاموش بیٹھ رہے گا۔ تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ اس وقت وہی کرو جیسا میں کہتا ہوں۔ میں ہر قدم پر تمھارا ساتھ دوں گا۔'' دلارے نے کہا تو اس کے جوش پر پانی پڑ گیا۔ اس نے مضمحل سی آواز میں کہا۔

''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے میرے یار۔ تو ہی مجھے صلاح دے کہ ان حالات کا سامنا میں آخر کیسے کروں؟'' اس نے ہتھیار ڈال دیئے تو دلارے نے تھوڑی دیر تک غور کرنے کے بعد آہستہ سے کہا۔

''اگر میری صلاح مانو تو ایکادھ ماہ کے لیے کہیں روپوش ہو جاؤ۔ جب تک یہ معاملہ پوری طرح سے دب نہیں جاتا، سامنے نہ آنا۔ میں کیدارو کو کچھ دے لے کر کسی طرح منانے کی کوشش کروں گا کہ وہ پولس میں رپٹ نہ لکھوائے۔ اگر وہ مان گیا تو ٹھیک، اور اگر نہ مانا تو پھر پولس والوں کو ہی کچھ لے دے کر منانے کی کوشش کرونگا۔'' دلارے نے تشویش کن لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے میرے بھائی۔ جو تیری صلاح۔ میں وہی کروں گا جو تو کہے گا۔ بس مجھے کسی طرح اس بلاوجہ کے جھنجھٹ سے نجات دلا دے۔ میں تیرا احسان مند رہوں گا۔ تو پچاس ہزار روپے رکھ لے۔ کیدار و اور پولس والوں کو منانے کے سلسلے میں ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' اتنا کہہ کر اس نے پانچ سو کے نوٹوں کی ایک گڈی الماری سے نکال کر دلارے کے ہاتھ پر رکھ دی اور سر تھام کر مسہری پر بیٹھ گیا جبکہ دلارے اسے دلاسا دیتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔ وہ اپنی کامیابی پر دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔

●

فسادیوں کا مذہب

ہڈیوں تک سرایت کر جانے والی جاڑے کی ٹھنڈی ہوائیں جتنی سرد اور تکلیف دہ ہوتی ہیں، دوپہر کی سنہری نرم دھوپ اتنی ہی دلکش اور جاذب۔ برفانی ہَواؤں کے سبب آج موسم کافی سرد ہو گیا تھا۔ ہر چند کہ راحیل اور شمون کو ہندو مذہب سے کچھ لینا دینا نہ تھا مگر اپنی بیوی کے اصرار پر اُسے شہر کی مشہور 'رام لیلا' دکھلانے نکلا تھا۔ زیادہ ٹھنڈ کے باعث طے شدہ صراحت کے مطابق انھیں زیادہ رات ہونے سے قبل گھر واپس لوٹ جانا تھا۔ تمام دوپہران دونوں نے مارکیٹنگ اور گھوم ٹہل کر گزارا۔ جب سورج غروب ہونے کو آیا تو وہ لوگ سیدھے رام لیلا میدان پہنچ گیے۔ لاتعداد برقی قمقموں اور بڑے بڑے ہیلوجن لائٹ سے خارج ہونے والی حدت اور انسانی ہجوم کے باوجود کھلے آسمان کی سرد ہواؤں کا اثر ہر کس و ناکس کے چہروں سے صاف عیاں تھا۔ ایسی خوبصورت اور جاذب نظر سجاوٹ اور انسانی چہل پہل کے باوجود نہ جانے کیوں شمون کا دل وہاں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اس جگہ سے جلد از جلد نکل کر اپنے گھر پہنچ جانا چاہتا تھا جبکہ راحیل کا دل گھر جانے کو ایکدم نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر وہیں رک کر 'سیتا ہرن' کا منظر دیکھنے کی خواہاں تھی مگر شمون کے بار بار اصرار کے سبب اس نے اس مقام پر زیادہ دیر تک رکنے کا ارادہ ترک کر دیا اور شوہر کے ساتھ گھر واپسی کے لیے کار میں جا بیٹھی۔

افواہ اور فرقہ وارانہ فساد کے لیے یہ شہر پورے ملک میں بدنام تھا۔ سننے تو یہاں تک ہیں کہ ایک مرتبہ دو عدد دَبنگ قسم کے سانڈوں کے پوری شدت اور جوش کے ساتھ لڑ جانے کے سبب چہار سمت زبردست بھگدڑ مچ گئی۔ بے تحاشہ بھاگنے والوں میں بیشتر

ایسے تھے جو اس بھگدڑ کی حقیقت سے قطعی نابلد، بس ایک دوسرے کی تقلید میں جدھر سینگ سمائی بھاگے جارہے تھے۔اس بھگدڑ سے دور اپنے مُحلّوں میں پہنچنے کے بعد کچھ لوگوں نے ایسے زوردار اور پراثر انداز میں بھگدڑ کا بیان ''اُس ایریا میں شاید دَنگا ہو گیا ہے'' کیا تو کچھ آگے بڑھ کر اس افواہ سے جب ''شاید'' لفظ از خود حذف ہو گیا تو اس افواہ نے عوام کے درمیان یقین کی صورت اختیار کر لی اور ہمیشہ کی مانند'ہر ہر مہادیو اور نعرۂ تکبیر....اللہُ اکبر' جیسے متبرک الفاظ ایک بار پھر معصوم انسانی زندگیوں کے درپے نظر آنے لگے تھے۔

مذہب کے اعتبار سے وہ یہودی تھے۔انھیں شہر میں ہر چھٹے چھماہے ہونے والے فرقہ وارانہ فساد سے کچھ لینا دینا نہ تھا۔نیک اور ہمدرد انسان کے مانند انسانی زندگیوں کے تلف ہونے پر اسے بھی افسوس ہوتا۔چونکہ فساد گزیدہ افراد سے اسے حد درجہ ہمدردی تھی اس لیے اپنی مالی حیثیت کے مطابق وہ ان لوگوں کی مدد دل کھول کر کرتا تھا۔وہ پھول، تتلیاں، جگنو اور آبشار دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔انسانیت پر ہو رہے ظلم دیکھ کر اس کی آنکھیں بھر آتی تھیں،اس لیے کہ اس کے خون کا رنگ لال تھا۔

ابھی انھوں نے نصف راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ شہر کے اُتّری حصے سے عجیب قسم کا شور بلند ہوا۔شمون نے اپنی توجہ جب اس شور کی طرف مبذول کی تو اُسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ شہر میں فساد بھڑک اُٹھا ہے، جبکہ شہر میں کہیں کسی قسم کا ٹنشن بھی نہیں تھا۔

''پتہ نہیں کیا ہو گیا آج کل کے انسانوں کو؟ کہنے کو ہمارے ملک نے اب اتنی ترقی کر لی ہے کہ جلد ہی ہم لوگ چاند ستاروں کی سیر کریں گے اور ہمارے ذہنی معیار ابھی فرقہ وارانہ فساد کی سطح سے اوپر بھی نہیں اٹھ سکے ہیں۔ہر فرقے کے لوگوں میں بس اپنے خدا کو اونچا اور دوسرے فرقے کے خداؤں کو نیچا دیکھانے کی ایک ہوڑسی لگی ہوئی ہے۔''

یہی سب بڑبڑاتے ہوئے اس نے اپنی کار شہر سے باہری راستے سے نکال کر اپنے گھر کی طرف جانے کا ارادہ کیا تو راحیل نے اُسے ایسا کرنے کو منع کرتے ہوئے کہا۔

''اِن خطرناک حالات میں ہم لوگوں کو جلد از جلد گھر پہنچنے کی فکر کرنی چاہیے۔ شہر سے باہر کا راستہ تو کافی لمبا ہے۔راہ میں کسی سنسان یا سناٹے علاقے میں پھنس گئے تو مصیبت ہوجائے گی۔ان دنگائیوں کا کیا بھروسہ۔اکثر ان کے قتل و غارت کا اصل مقصد لوٹ پاٹ ہی ہوتا ہے اور ظاہر ہے، چونکہ ہم لوگ کار میں سوار ہیں اس لیے......!''

''میرا دل تو نہیں چاہتا کہ میں ایسے حالات میں بیچ شہر والے راستے سے گھر جاؤں مگر تمھارا یہ کہنا بھی درست معلوم ہوتا ہے اکثر فسادیوں کا اصل مقصد لوٹ پاٹ ہی ہوتا ہے۔ٹھیک ہے، میں شہر کی طرف سے ہی چلتا ہوں۔ابھی چونکہ فساد کی شروعات ہے اس لیے عوام میں زیادہ تر لوگ اپنے گھروں کی طرف ہی بھاگ رہے ہوں گے۔ہم لوگوں کو بھی انھیں کی بھیڑ میں شامل ہو کر نکل جانا چاہیے۔'' اور اس نے اپنی کار شہر والی شاہ راہ کی طرف موڑ دی۔ابھی وہ تھوڑی مسافت طے کر کے ایک گھنی آبادی والے محلے کی طرف مُڑا ہی تھا کہ ایک بڑے مجمعے کو اِسی طرف آتا ہوا دیکھ کر اس نے اپنی کار دوسری جانب موڑ دی مگر اُدھر سے بھی ایک بھیڑ دیوانہ وار شور مچاتی ہوئی اسی کی طرف آتی ہوئی دکھائی دی تو اس نے گاڑی کی رفتار بڑھانے کے بجائے کم کر دی۔آن کی آن میں سیکڑوں فسادیوں نے اس کی کار کو گھیر لیا۔موت کو خود سے اتنے قریب دیکھ کر ان دونوں کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے مگر اس نے اپنے چہرے سے ایسا کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔فسادیوں میں سے ایک شخص نے اس کے قریب آ کر بھاری آواز میں سوال کیا۔

''تمھارا تعلق کس مذہب سے ہے؟'' اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں۔

''میں.....میں.....مم......''

''مُسلمان ہو؟'' فسادی نے خود ہی کہا۔

''جی ہاں جناب......ہم لوگ مُسلمان ہیں اور......!''

''کہیں جان جانے کے خوف سے یہ جھوٹ تو نہیں بول رہا ہے؟'' اس کے ایک

ساتھی نے کہا۔اس کے ہاتھ میں تلوار جیسا ایک بڑا سا چُھرا تھا۔

''نہیں جناب میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔''اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو کُران سرپھ کا کوئی سورہ پڑھ کر سناؤ۔''اسی شخص نے کچھ اور قریب آ کر شمون کو حکم دیا۔اس کی بیوی یہ سن کر بری طرح خائف ہوگئی تھی۔

''جی ہاں۔سُناتا ہوں۔''اتنا کہنے کے بعد اس نے تورات کے ایک سورہ کی تلاوت کی، جسے سننے کے بعد پہلے والے شخص نے اپنے باقی ساتھیوں سے یہ کہتے ہوئے ان کا راستہ چھوڑ دیا۔

''ای لوگ واکئی میں مسلمان مالوم ہوتے ہیں۔جانے دو بھائی۔یہ لوگ بھی اپنے بھائی ہیں.....جایئے بھائی،سلاں والے کم۔''اور شمون نے اپنی کار آگے بڑھا دی۔جب راحیل کو یقین ہوگیا کہ وہ لوگ فسادیوں کی زد سے کافی دور نکل آئے ہیں تو اس نے آہستہ سے کہا۔

''شمون،آج رب نے ہم پر بڑا کرم کیا۔شاید ہماری کوئی نیکی کام آئی۔مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔انھوں نے تم سے کہا تھا قرآن شریف کا کوئی سورہ پڑھ کر سناؤ تو تم نے انھیں تورات کا سورہ سنایا اور ان لوگوں نے اس پر دھیان تک نہ دیا۔لگتا ہے کہ جیسے......''اس کی باتوں سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ جیسے اس کا حلق اتنا زیادہ خشک ہوگیا ہے کہ اس کے مُنہ سے آسانی سے آواز بھی نہیں نکل رہی ہو۔

''تمھارا خیال ایکدم درست ہے راحیل۔میرا دعوا ہے کہ ان میں سے ایک بھی شخص قرآن شریف کے کسی سورہ یا اُس کی عظمت سے قطعی واقف نہیں تھا۔قرآن شریف اور اس کی عظمتوں سے واقفیت رکھنے والے نہ تو مذہبی اعتبار سے درندہ صفت ہو سکتے ہیں نہ ہی اتنے گھٹیا اور نیچ۔حقیقتاً فسادیوں کا کوئی مذہب ہی نہیں ہوتا۔''اور اس نے کار کی رفتار بڑھا دی۔

●

کُتے کا ایکسیڈنٹ

صبح کا وقت ہونے کی وجہ سے شہر کی شاہ راہ پر ٹرافِک کچھ زیادہ ہی تھا۔ عوام کے علاوہ اسکول جانے والے طلاب کی بسوں اور رکشہ کے ساتھ ساتھ دفتر جانے والے حضرات بھی حسب حیثیت ذاتی سواریوں سے منزل مقصود تک وقت پر پہنچ جانے کی ہوڑ میں ایک دوسرے سے ریس لگائے ہوئے تھے۔ اس دوران اتفاقاً جب دو بڑی گاڑیاں آمنے سامنے آ جاتیں تو پورا ٹرافِک تقریباً رینگنے لگتا تھا۔ تیز بائک چلانے والے کم عمر شائقین کے آگے نکل جانے کے لیے یہ موقع بہترین ثابت ہوتا تھا۔ شہر کی شاہ راہ پر بے لگام دندناتے پھرنے والے آوارہ جانوروں کے لیے ٹرافِک کا اصول کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ اکثر ٹرافِک کے اصولوں کی اَن دیکھی کرتے ہوئے تیز رفتار بائک والوں پر بھی سبقت لے جاتے اور بخیر و عافیت سڑک پار کر لیتے تھے۔

آج ایک آوارہ کتا، رفتار اور وقت کے اندازے کی معمولی سی لغزش کے سبب اپنے تحفظ کی لاکھ کوششوں کے باوجود ایک تیز رفتار بائک کے لپیٹے میں آ کر زخمی ہو گیا۔ زخم کھا چکنے کے باوجود، اُس وقت تک اس کتے کی رفتار میں سرِ مو فرق نہیں آیا جب تک وہ سڑک پار کر کے نالی سے لگے دوکان کے چبوترے کے نیچے والے ایک محفوظ پتھر کی اوٹ تک نہیں پہنچ گیا۔ اس محفوظ مقام تک پہنچ جانے کے باوجود اس کے حلق سے کریہہ آوازیں نکلنا اب تک بند نہیں ہوئی تھیں۔ اس کرب ناک آواز نے بیشتر راہ گیروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی تھی۔ جتنا منہ، اُتنی باتیں۔ ''سارا قصور بائک والے کا ہے۔ ارے، وہ بریک نہیں لگا سکتا تھا کیا؟'' ایک راہگیر نے کتے کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی۔

''بائک والا بیچارہ کیا کرتا، جب کُتا خود ہی دوڑ کر اس کے پہیئے سے ٹکرا کر زخمی ہو گیا۔'' دوسرے کی ہمدردی بائک والے کے ساتھ تھی۔

''سارا قصور نگر پالیکا والوں کا ہے۔ تمام شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں آوارہ جانور کھلے عام دندناتے پھر رہے ہیں مگر میونسپلٹی والوں نے جیسے ان کی طرف سے آنکھیں ہی موند لی ہیں۔ ابھی پچھلے مہینے ایک شخص کو ایک سانڈ نے اُٹھا کر ایسا پٹخا کہ دو روز کے علاج کے بعد بیچارے نے اسپتال میں دم توڑ دیا۔'' ایک نیتا قسم کے آدمی نے ہانک لگائی۔

''اس آوارہ کُتے کی وجہ سے اگر بائک والے کو کچھ ہو جاتا تو؟'' ایک بزرگ راہ گیر کی پوری ہمدردی بائک والے کے ساتھ تھی۔

"No, no....bike rider is at fault. He is not having control to his speed. Dog has been badly injured due to his neglegency. O, man .... O, Mr.........you are responsible for this accident."

ایک انگریز عورت بائک والے پر الزام لگانے کے ساتھ ہی اپنے رکشہ سے اُتری اور نوجوان کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ ٹوٹی پھوٹی اردو بولنے والی اس سوشل ورکر قسم کی عورت نے اس نوجوان سے مخاطب ہو کر کہا تو وہ ایک دم سے جھنجلا گیا۔

''آپ بلا وجہ اس خارش زدہ آوارہ کتے کی حمایت کرنے کی غرض سے تمام ٹریفک روکے ہوئے ہیں۔ وہ کمبخت خود ہی دوڑ کر میری بائک سے ٹکرا گیا تھا۔ اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' نوجوان کے اس طرح صفائی پیش کرنے پر دو تین راہ گیروں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی مگر اس انگریز عورت کی بے وجہ چیخ پکار کے آگے نوجوان کی ایک نہ چلی۔

''ٹوم رانگ سائڈ......اِس ڈاگی کو داکا ماری۔ گلٹی ٹومارا۔ مَیں اس کا آئی وِٹنس ہائے۔'' وہ بضد تھی۔

''ارے، اگر آپ چشم دید گواہ ہیں تو میرا کیا بِگاڑ لیں گی؟ ایک لاوارث اور

آوارہ کُتے کے لیے آپ بلا وجہ کا ہنگامہ کرنے پر اُتارو ہیں۔ اس طرح کے نہ جانے کِتنے کتے بلی روز گاڑیوں کے نیچے آ کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ چلیے ہٹیے سامنے سے، مجھے دفتر جانے میں دیر ہو رہی ہے۔'' نوجوان نے اُسے سمجھانا چاہا۔

''تُمارا سوچنا گلٹ ہائے۔ کُتّا بِلّی کو بھی Almighty God نے پیدا کیا۔ اس کا بھی animal rights ہائے۔ ہیاں India میں بھی۔ تُم کو اِس کا داوائی عِلاج کرانا ہوگا۔ ہم ٹومارا اَنڈ ڈ کرے گا۔'' اور اس نے اپنے بیگ سے ایک بڑا سا تولیا نکال کر اس زخمی کتے کو اس میں لپیٹا اور اپنے رکشہ کے پائیدان پر رکھ دیا۔ اب کتا خاموش ہو چکا تھا۔

''ارے میڈم، اسے آزاد چھوڑ دیجیے۔ یہ اپنا معمولی سا زخم چاٹ واٹ کر خود ٹھیک کر لے گا۔ یا اگر آپ کو آوارہ کتوں کی خدمت کا شوق ہے تو آپ اپنا شوق پورا کیجیے۔ آپ کی وجہ سے مجھے آفس جانے میں پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے۔ میں تو چلا۔ اتنا کہتے ہوئے نوجوان نے جیسے ہی اپنی بائک اسٹارٹ کی، اس عورت نے بائک کی ہینڈل پکڑ لی۔ اب وہ خاصی غصے میں نظر آ رہی تھی۔

''ٹوم ہم کو under estimate کرٹی ہائے۔ ٹم شاید ہام کو ٹیک سے نائی جانٹی young man میں British animal rights کا Chairperson ہائے۔ ٹم جانٹی؟ جاؤ مگر مَیں اس ڈاگی کا علاج کرائے گا اور ٹمارا کھِلاپ F.I.R. کرے گا۔ بھارٹ کا animal rights ministry کو لکھے گا، سمجھی؟ ہام ٹمارا بائک کی نمبر پلیٹ سے اس کا رجسٹریشن نمبر نوٹ کر لیا ہائے۔''

اُس نے اپنے عہدے کے ساتھ اس نوجوان کو جس انداز سے دھمکی دی، وہ واقعی سہم گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ انگریز عورت اس کے خلاف کوئی نہ کوئی قدم ضرور اٹھائے گی۔ اس مصیبت میں پھنسنے سے بہتر تو یہی ہے کہ اس کی بات مان لی جائے۔ کتے کو لے کر کسی نزدیکی 'ڈاگ کلینک' تک چلنے میں ہی بھلائی ہے۔ اس مصیبت سے دفتر کی دیر بھلی۔ اس نے کتے کے علاج کی غرض سے، بادل ناخواستہ، اس عورت کے رکشہ کے پیچھے اپنی بائک

لگا دی۔ تقریباً دو فرلانگ کی مسافت طے کرنے کے بعد جب ایک 'Dog Clinic' دکھائی دیا تو عورت نے رکشہ اس کے دروازے پر رکوا دیا تو نوجوان نے بھی اپنی بائک سڑک کے کنارے کھڑی کر دی۔ عورت، تولیے میں لپٹے ہوئے کتے کو اس طرح سینے سے لگائے ہوئے کلینک میں داخل ہوئی جیسے وہ اس کی اپنی اولاد ہو۔ اس نے زخمی کتے کو dressing table پر رکھ دیا۔ نوجوان بھی وہیں پاس کھڑا تھا۔ ڈاکٹر کسی دوسرے پالتو کتے کو انجکشن لگا رہا تھا۔ جب اُسے فرصت ہوئی تو وہ اس عورت کو سوالیہ نگاہوں نے دیکھنے لگا۔

''یہ کوتا اس آدمی کا بائک کے نیچے آ گئی ہائے۔ اس کا ڈریسنگ کر کے اس کو سب جروری ڈوائی اور انجکشن دے دو''۔ اس نے ڈاکٹر سے مخاطب ہو کر کہا۔

''Yes Mam اس کا پیر پکڑ لیجیے۔ معمولی سا زخم ہے۔ میں اس کی ڈریسنگ کر دیتا ہوں۔'' عورت نے ڈاکٹر کی ہدایت پر کتے کے جسم سے تولیا الگ کیا تو کتا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"Sit.....Sit....." ۔ وہ کتے کو ہدایت دیتی رہی مگر اس نے انگریز عورت کی ایک نہ سنی۔ کتے نے ڈریسنگ ٹیبل سے چھلانگ لگانا چاہا تو عورت نے اس کی زخمی ٹانگ پکڑ لی۔ کتے نے خود کو مصیبت میں گرفتار محسوس کیا تو چشم زدن میں عورت کے اس ہاتھ کو نوچ لیا جس ہاتھ سے اس نے کتے کا پیر پکڑ رکھا تھا۔ پیر پر گرفت کمزور پڑنے کے بعد کتا ایک جست میں کلینک سے باہر نکل بھاگا۔ جب تک ڈاکٹر یا وہ نوجوان کچھ سمجھ پاتے، کتا، یہ جا، وہ جا، ایک گلی میں گھس کر آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ عورت اپنے لہولہان ہاتھ پکڑے ہوئے کراہ رہی تھی "Doctor, please see my hand, let him go....."

اور ڈاکٹر اسے اسپتال جانے کی صلاح دیتے ہوئے اپنے دوسرے مریض کی طرف متوجہ ہو گیا۔

نوجوان نے "May I help you, Madam?" کہا تو وہ نوجوان کو گھورتی ہوئی اپنے رکشہ پر بیٹھتے ہوئے رکشہ والے کو اسپتال چلنے کی ہدایت دی۔ ''کمبخت، بلاوجہ آج آفس میں اتنی دیر ہو گئی''۔

رسّا کشی

ریل گاڑی اپنے معینہ وقت سے آٹھ گھنٹے لیٹ چل رہی تھی۔ اسی سبب بیشتر مسافروں کے موڈ خراب تھے۔ احمد اس ڈبے میں بیٹھا شاید تنہا مسافر تھا جو دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ کاش یہ گاڑی دو گھنٹے اور لیٹ ہو جاتی تو بہتر تھا۔ اگر گاڑی صحیح وقت پر منزل مقصود پر پہنچ گئی ہوتی تو وہ زیادہ سے زیادہ شب کے نو بجے تک کسی ہوٹل میں پہنچ کر آرام کر رہا ہوتا۔ گاڑی کے آٹھ گھنٹے لیٹ ہو جانے کی وجہ سے وہ خود کو ایک دم سے بیچ ادھر میں پھنسا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اسی لیے وہ چاہ رہا تھا کہ گاڑی اور لیٹ ہو جائے تا کہ کچھ عرصہ اور چین سے سو لے اور رات کے بجائے صبح سویرے گاڑی اسٹیشن پر پہنچے تو بہتر ہوگا۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ جب اس کی گاڑی جموں پہنچی تو اس وقت شب کے ساڑھے تین بجے تھے۔ اس نے اپنا سامان سمیٹا اور پلیٹ فارم پر اُتر گیا۔ شہر اس کے لیے قطعی انجان تھا اس لیے صبح کا اجالا پھیلنے تک اس نے پلیٹ فارم پر ٹہل گھوم کر وقت گزاری کا ارادہ کرتے ہوئے اپنا سوٹ کیس ایک کنارے رکھ کر اسی پر بیٹھ گیا۔ اسے صبح ہونے تک اسی پلیٹ فارم پر رکنا تھا چنانچہ وقت گزارنے کی غرض سے وہ ایک اخبار لے کر پڑھنے لگا۔ وہ فوج میں ملازمت کرتا تھا۔ اس کا تبادلہ بنگلور سے جموں ہوا تھا۔ اسے آج جموں میں نوکری جوائن کرنا تھی۔ وہ پڑھائی لکھائی میں اچھا تھا۔ اسے فوج کے علاوہ دوسرے سرکاری محکمے میں بھی بآسانی نوکری مل سکتی تھی مگر ملک کی خدمت کے جذبے کے تحت اُس نے اِس نوکری کو فوقیت دی تھی۔ جب صبح کے چھ بج گیے تو اس نے اپنا سامان سمیٹا اور باہر نکل کر ایک رکشہ تلاش کیا۔ تقریباً پندرہ منٹوں کی مسافت طے کے بعد وہ منزل مقصود پر

پہنچا۔ چھاونی کے دفتر میں پہنچ کر اس نے ڈیوٹی پر موجود افسر کو سلوٹ کرنے کے بعد ٹرانسفر کے کاغذات اسے پیش کیے۔

''محمد احمد علی رپورٹنگ سر......!''

''فی الحال اپنا سامان بیرک نمبر گیارہ میں رکھ کر اگلے حکم کا انتظار کرو۔ تھوڑے عرصے کے بعد تمھارے لیے اگلا آرڈر جاری کر دیا جائے گا۔'' اس افسر نے کاغذات غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یس سر۔'' اتنا کہنے کے بعد اس نے افسر کو دوبارہ سلوٹ کیا اور واپسی کے لیے مڑ کر کمرے سے باہر نکلنے کے بعد سیدھا بیرک نمبر گیارہ کی طرف چل دیا۔ بیرک میں داخل ہونے کے بعد سامنے کھڑے ایک سپاہی سے اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ''میرا نام محمد احمد علی ہے۔ میں نے 'سر' کو جوائننگ دے دی ہے۔ انھوں نے فی الحال مجھے یہیں ٹھہرنے کی ہدایت دی ہے۔'' یہ سُن کر اس سپاہی نے اپنے دوسرے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہا۔

''ارے مَادھو بھیا، جو میاں جی آج جوائن کرنے والا تھا نہ، او یہی ہے۔ کہہ رہا ہے کہ بڑا صاحب کے آپس میں جوائنگ دے دیا ہوں۔ او یہیں ٹھہرنے کو بولے ہیں۔'' یہ سن کر اس کے ساتھی مَادھو نے اسی ٹون میں کہا۔

''ت ایسا کریئے نہ مسرا جی کہ میاں جی کے ایک ٹھے چٹائی دے دیجیے، او ہے پر بیٹھ کر نیواج پڑھیں۔'' احمد کو اپنے سلسلے میں ان لوگوں کی باتیں ناگوار تو لگی تھیں مگر وہ عادتاً صرف مسکرا کر رہ گیا۔ جس دن سے اس نے ہوش سنبھالا تھا اس طرح کی پھبتیوں اور جملے بازیوں سے ہمیشہ اس کا سامنا ہوتا رہا۔ اسے اپنے لیے اہانت آمیز جملے کبھی ناگوار نہیں لگے بلکہ اسے اپنے دوسرے ہندوستانی بھائیوں کی اس قسم کی فکر پر افسوس ہوتا تھا۔ اسے ہمیشہ یہی محسوس ہوتا تھا کہ ہمارے پچھڑے پن کی خاص وجہ صرف اس طرح کی

ذہنیت ہے۔ ذات پات، اونچ نیچ، فرقہ واریت، صوبہ پرستی اور انا پسندی کو چھوڑ کر کب ہم تمام ہندوستانی، اصل معنی میں خالص ہندوستانی بن سکیں گے۔ پتہ نہیں ہم لوگوں کی سمجھ میں یہ بات کب آئے گی کہ ہمارے ملک کی ترقی میں سب سے بڑی بادھا ہم لوگوں کی یہی آپسی رساکشی ہے۔

احمد کو جمو میں نوکری جوائن کیے ہوئے دو ماہ گزر چکے تھے۔ اپنی خوش مزاجی اور ہمدردانہ طبیعت کے باعث وہ تمام یونٹ میں ہر دل عزیز ہو گیا تھا۔ وہ ہر چھوٹے بڑے کی صدق دل سے عزت کرتا تھا۔ اسی وجہ سے اب اس یونٹ کے بیشتر فوجی اسے پسند کرنے لگے تھے مگر اس کے ساتھیوں میں آج بھی مادھو کے مزاج میں سرمو فرق نہیں آیا تھا۔ وہ اکثر موقع بے موقع ذات، صوبے یا مذہب سے متعلق پھبتیاں کسنے سے باز نہیں آتا تھا۔ اپنی فطرت کے مطابق احمد برا ماننے کے بجائے انھیں درگذر کر کے صرف مسکرا دیتا تھا۔ مادھو کو اس کے اس طرح کے رویہ پر حیرت بھی ہوتی، پھر بھی وہ دل دُکھانے والی اپنی عادت سے باز نہ آتا۔

آج لنچ لینے کے بعد احمد اپنے پندرہ بیس ساتھیوں کے ہمراہ 'کامن ہال' میں بیٹھا کرکٹ میچ دیکھ رہا تھا۔ یہ میچ چونکہ بھارت اور پاکستان کے درمیان ہو رہا تھا اس لیے اس کی اہمیت کچھ زیادہ تصور کی جا رہی تھی۔ ابھی میچ شروع ہوئے آدھا گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ بھارت کے پانچ وِکٹ بہت کم رنوں پر گر گیے۔ اسی سبب میچ دیکھنے والوں کا موڈ یکسر خراب ہو گیا اور احمد یہ کہتے ہوئے وہاں سے اُٹھ گیا کہ ''اب یہ میچ بور کرے گا، اس لیے میں تو چلا۔'' وہ کرسی سے اٹھا ہی تھا کہ اس کے ساتھی سپاہی مادھو نے اسے چڑھانے کی غرض سے کہا۔

''ہاں بھئی، یہاں سے تمھارا چلا جانا ہی بہتر ہے کیوں کہ تم تو ٹھہرے میاں بھائی، بھلا پاکستان کی جیت کی خوشی کا اظہار ہم لوگوں کے درمیان کیسے

کروگے۔''اس نازیبا کمنٹ پر احمد تو پہلے کی طرح ہی خاموش رہا مگر مادھو کے ایک ساتھی کو یہ بات بری لگی تو وہ خاموش نہ رہ سکا اور چڑھ کر بولا۔

''بڑے بیہودے ٹائپ کے آدمی ہو یار تم......تمھاری کوشش ہمیشہ یہی ہوتی ہے کہ اپنے الٹے سیدھے کمنٹ سے دوسروں کا دل دُکھاؤ۔کبھی کسی کو'بہاری' کہہ کر چڑھاتے ہو تو کبھی کسی کو اس کی ذات برادری کا نام لے کر۔تم کیا سمجھتے ہو،تمہاری اِن حرکتوں سے دوستوں اور ساتھیوں کے درمیان تمہاری عزت بڑھے گی؟اور یہ بیچارہ احمد تو اتنا شریف اور نیک انسان ہے کہ ہمیشہ ہنس کر ٹال جاتا ہے۔یہ ٹھیک نہیں ہے مادھو۔ تمھیں اپنے ساتھیوں کی مَریادا کا دھیان رکھنا چاہیے۔کسی بھی بُرے وقت میں یہی بہاری،مراٹھی، بنگالی، مسلمان اور دوسری برادری والے ساتھی ہی تمہارے کام آئیں گے۔تمہارے گھر،برادری یا صوبے والے نہیں۔''مگر اُس سپاہی کی باتوں کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور مادھو نے بغیر سوچے سمجھے احمد کو اس کی ذات کے نام پر گالیاں بکنی شروع کر دی۔اب پانی چونکہ سر سے اوپر ہو گیا تھا اس لیے مادھو کی امید کے خلاف احمد اس پر جھپٹ پڑا تو ایک سپاہی نے اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے دونوں کے درمیان آ کر فی الحال ہاتھا پائی کی نوبت نہیں آنے دی اور معاملہ درگزر ہو گیا۔احمد نے اس سپاہی کی باتیں مان تو لیں مگر یہ کہتا ہوا کامَن ہال سے باہر نکل گیا کہ ''مادھو کو شرافت کی زبان سمجھ میں نہیں آتی،اس لیے کسی نہ کسی دن میں اسے سبق ضرور سکھاؤں گا۔آج کے بعد مجھ سے سا[illegible]ان رہنا مادھو۔''مادھو کو احمد سے چونکہ جارحانہ ردعمل کی امید قطعی نہیں تھی اس لیے وہ احمد کے تیور دیکھ کر اس سے ڈر گیا تھا اور احمد کی طرف سے مستقبل کے خطرات کا اندازہ کر کے کافی گھبرا بھی گیا تھا۔اپنے اس بیہودہ عمل پر اسے آج واقعی پچھتاوا ہو رہا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ عموماً سرد مزا[illegible] شخص پر جب غصہ طاری ہوتا ہے تو نسبتاً وہ زیادہ خونخوار ہو جاتے ہیں۔

احمد کی طرف سے لاحق خدشات کی بنا پر مَادھو ہفتے عشرے تک احمد سے ذرا دور دور ہی رہا۔ اسے امید تھی کہ چونکہ احمد شریف اور نیک طبع انسان ہے اس لیے وہ ساری باتیں جلد ہی بھول جائے گا پھر بھی، اس کے دل میں احمد کی طرف سے ایک قسم کے فطری خوف نے گھر بنالیا تھا، جس کا اس کے پاس کوئی علاج نہ تھا۔

وقت اور حالات کے سلسلے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ کب کس کے موافق ہوجائے یا کب کس کی مخالفت پر آمادہ ہوجائے۔ فوج کے یہ تمام جوان جو کل تک صرف پریڈ کرتے، ٹریننگ لیتے، کھیل کود اور دوسری مصروفیات میں سرگرم رہتے تھے، آج اچانک ایک خبر پر تمام صراحت یکسر تبدیل ہوگئیں۔ ایک عدد ایمرجنسی اَلارم پر ہر طرف افراتفری کا ماحول نظر آنے لگا۔ فوج کے تمام جوان اپنی مشغولیات ترک کر کے اپنے افسران کا نیا اور تازہ حکم سننے کی غرض سے پریڈ گراؤنڈ میں یکجا نظر آرہے تھے۔ افسر کا تازہ حکم کچھ اس طرح تھا کہ پڑوسی ملک کی بڑی فوج ہمارے ملک کے 'کرگل' نام کے علاقے میں غیر قانونی طور پر گھس آئی ہے۔ انھیں اپنے علاقے سے باہر نکالنے کے لیے تمام فوج کو مسلح ہوکر کارروائی کا حکم سنایا گیا تھا۔

یہ ناگہانی خبر سن کر تمام جوانوں پر عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی۔ آن کی آن میں ہر یونٹ کے تمام جوان مسلح ہوکر اپنے کمانڈروں کے حکم کی تعمیل میں منزل مقصود کی جانب چل پڑے۔ جس یونٹ میں احمد تھا، اس کا انچارج احمد کو ہی بنایا گیا تھا۔ یہ خبر سن کر تو جیسے مَادھو کے ہاتھ پاؤں ہی پھول گیے۔ اسے یقین تھا کہ احمد بدلا لینے کی غرض سے اسے کسی خطرناک پوائنٹ پر ہی تعینات کرے گا۔

کرگل کی سنگلاخ اور مخروطی پہاڑیوں پر گذشتہ کئی دنوں سے گھمسان مچا ہوا تھا۔ پڑوسی ملک کی افواج نے پورے علاقے پر فوجی بنکر بنا بنا کر زبردست طریقے سے قبضہ جما رکھا تھا۔ ان کی فوجیں اس علاقے پر کچھ اس طرح سے قابض نظر آرہی تھیں کہ

بادی النظر میں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ان پر آسانی سے قابو پانا مشکل ہوگا مگر ہندوستانی فوجوں کے زبردست دلیرانہ حملوں کے باعث جلد ہی ان کے پیر اُکھڑنے لگے۔ جب سوائے پیچھے ہٹنے کے ان کے سامنے کوئی راستہ نہیں رہ گیا تو جاتے جاتے وہ لوگ ہندوستانی افواج کی جانوں کے درپے نظر آنے لگے۔ کرگل کے جس علاقے پر احمد کی یونٹ والے جمے ہوئے تھے وہاں اِن لوگوں نے اپنے دفاع کی غرض سے کھائیاں کھود رکھی تھیں جن میں بیشتر سپاہی چھپے ہوئے تھے مگر مصلحتاً احمد نے مَادھو سمیت کئی سپاہیوں کو کھلے علاقوں میں بھی تعینات کر رکھا تھا۔ احمد انھیں کے قریب کھڑا آنکھوں پر دوربین جمائے قرب وجوار کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک اس نے دیکھا کہ سامنے کی پہاڑیوں میں پوشیدہ ایک فوجی بنکر سے پڑوسی ملک کے بہت سے مسلح فوجی برامد ہوئے تو اس نے ایک پل کی بھی دیر کیے بغیر ''ہوشیار مَادھو'' کہا اور اسے ایک زبردست دھکا دے کر پاس کی کھائی میں ڈھکیل دیا۔ جب تک مَادھو کچھ سمجھ پاتا، دونوں اطراف سے گولیوں کی بوچھار شروع ہوگئی۔ جب تک وہ لوگ سنبھلے، احمد اور اس کے ساتھیوں کے پہلے ہی حملے نے ان لوگوں کی کمر توڑ دی۔ ان میں سے بیشتر مارے گئے اور جو بچ رہے وہ واپس اپنے ملک کی سرحد کی طرف بھاگ نکلے۔ گولیوں کی آوازیں بند ہونے کے بعد جب مَادھو کھائی سے باہر نکلا تو وہاں کا منظر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس کے سامنے پڑوسی ملک کے درجنوں سپاہی مرکر جہنم رسید ہو چکے تھے۔ میدان پوری طرح ہندوستانی فوج کے قبضے میں آچکا تھا مگر ان کا یونٹ کمانڈر احمد، خاک وخون میں غلطاں ان کی آنکھوں کے سامنے زمین پر لوٹ رہا تھا۔ اسے اتنی گولیاں لگ چکی تھیں کہ اس کا چہرہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ احمد کو اس حال میں دیکھ کر مَادھو بے اختیار اس سے لپٹ کر پھوٹ پڑا۔

''احمد، میرے بھائی، تو نے مجھے بچانے کے لیے اپنی جان گنوا دی۔ یہ تو نے کیا کیا میرے بھائی؟'' اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔

''مجھے خوشی ہے میرے بھائی مادھو کہ میری جان اپنے ملک کی عزت کے ساتھ اپنے ایک بھائی کو بچانے میں بھی کام آئی۔ میں بہت خوش ہوں میرے بھائی۔ خدا...... حا.....فظ۔ خدا حافظ میرے بھائی مادھو۔ خدا حافظ میرے وطن ہندوستان۔'' اور اس کی آنکھیں مادھو کی طرف پھر کر پتھرا گئیں۔ اس کے چہرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ پوری طرح مطمئن ہے۔ اس کے ہونٹ پہلے کی طرح مادھو کو دیکھ کر اب بھی مسکرا رہے تھے جبکہ مادھو مسلسل روئے جا رہا تھا۔

●

نسل کشی

'اولاد نہ ہو تو ایک غم......!' انیس اور اس کے گھر والوں کو فی الحال ایک ہی غم تھا۔ انیس اور اس کے والدین سے زیادہ انیس کے چچا چچی اور تایا تائی اس کے لیے فکر مند تھے۔ اس کی واحد وجہ یہی تھی کہ تین بھائیوں کے درمیان انیس اکیلی اولاد تھا اس لیے سب کی یہی خواہش تھی کہ انیس کے بہت سے بچے ہوں تا کہ ان کے خاندان کا نام آگے بڑھ سکے۔ ویسے تو انیس کی شادی کو ابھی دو ہی برس گزرے تھے مگر اس دوران ان لوگوں نے انیس کے صاحب اولاد ہونے کے لیے کوئی روضہ رسولؐ، دعا تعویذ نہیں چھوڑا تھا۔ بقول انیس کی چچی کے ''آج کل اللہ میاں کے بھی پتہ نہیں کا ہو گوا ہے جو اُن کا حساب کتاب صحیح ناہیں رہتا۔ اُس کلوا ناؤ وے کے دیکھ لیو، کھائے کا ٹھکانا نا ہے اور او کے آٹھ کے لڑیکا ہو چکا ہے اور لگے تھے کہ ابہن اور ہوئی۔ ہیاں تین جنے کے بیچ ایک ٹھے ٹوٹو ہوں ٹوں ہیں اور انہوں کی سادی کا دوئی بریس ہوئی گوا......اب سوچی تھے کہ کوئی دن دلہن کا اسپتال لے جا کے دکھا دے ای۔ سائد دوا دارو سے کچھ بات بن جائے۔ دعا کرت کرت تا جبان گھس گئی۔'' مگر سوال تو یہ ہے کہ وہ بڑے اسپتال تک جائے گی کس کے ساتھ؟ اس گھر کے مَردوں کو تو فرصت ہی نہیں رہتی اور عورتوں کا یہ حال ہے کہ نگوڑی اپنے گھر کا صدر دروازہ تک نہیں پہچان سکتیں۔ بہر حال، اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ انیس کی بیوی کو دکھانے کی غرض سے بڑے اسپتال جائے گی ضرور۔ اپنے ساتھ چلنے کے لیے محلے کی کسی جہاں دیدہ عورت کو ساتھ لے لے گی۔ مگر کسے؟ وہ غور کرنے لگی۔ اچانک اسے مہرن کا خیال آیا تو اس نے اسے بلوا بھیجا۔ مہرن ایک سوشل ورکر مگر تڑے اور مرد مار قسم کی

زیادہ بولنے والی عورت تھی۔ اس کے اسی طرز کی وجہ سے قریب قریب سارے گاؤں میں اس کی دھاک تھی اور لوگ اسے "چالو" بھی کہا کرتے تھے۔

مہرن نے جب ساری باتیں سنیں تو سب سے پہلے یہ رائے دی کہ "دیکھو دُلہن، ہمرے کھیال سے بڑے اسپتال کا چکر تو چھوڑ وا اور ہمری مانو تَ بلاک والے اسپتال چلو۔ ہُواں آجکل ایک ٹھے بڑی اچھی ڈاگڈرنی آئی ہے۔ او ہے کے دکھاو۔ اللہ کے پھجل سے چھٹکی دلہن کی گودی بھی جلدیے بھر جائی۔ اور سب سے بڑی بات تَ ای ہے کہ نگنوا بھی بلاکے والے اسپتال میں دائی ہے۔ بکھت پڑے پَ کامے آئی۔" مہرن ایک سانس میں سب کچھ کہہ گئی۔

"کون نگینہ؟ ہم ناہیں جنتے۔" انیس کی چچی نے ذہن پر زور دیتے ہوئے سوال کیا۔

"ارے او ہے جون گھراں گھراں بچہ بُلاوتھی ہو۔ او ہے، حدُ وابو۔"

"اچھا او ہے۔ اوکمبکھت تَ اپنے کاکَونو ڈاکٹرنی سے کم نائے سمجھتی۔ کھیر، ہمے تَ کام سے مطلب ہے۔" انیس کی چچی نے کہا۔

طے شدہ صراحت کے مطابق جمعرات کی صبح یکہ منگایا گیا اور دستور کے مطابق اس پر کمانی باندھی گئی اور اس کے چاروں طرف چادر لپیٹ کر پردے کا اہتمام کیا گیا۔ پہلے مہرن پھر انیس کی بیوی اور اخیر میں انیس کی چچی یکہ پر سوار ہوئیں۔ یکہ، گاؤں کی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر ہچکولے کھاتا مریل چال سے چلنے لگا۔ جب یکے کا پہیا کسی گڑھے میں جا پڑتا تو اس کے ہچکولے کے ساتھ ہی انیس کی چچی کے منھ سے بے ساختہ "یا مولیٰ" نکل پڑتا۔ ایک بار تو اس نے جھنجھلا کر مہرن سے کہہ بھی دیا کہ "ہٹو رانی، ای کئی سا اِکا ہے۔ ایسے کہو کہ تنی کاندے سے ہکاوے۔" اور مہرن کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اسی کسمپرسی کے عالم میں وہ لوگ تقریباً دس بجے بلاک والے ہسپتال پہنچے۔ ہسپتال کیا تھا، چار کمروں پر مشتمل

ایک بنگلہ نما گھر تھا۔ نہ بھیڑ بھاڑ، نہ شور شرابا، نہ زیادہ مریض، نہ زیادہ ڈاکٹر۔ ہر طرف گندگی کا راج تھا۔ بڑے ڈاکٹر صاحب ابھی تک نہیں آئے تھے لیکن لیڈی ڈاکٹر آ گئی تھی۔ ان کے علاوہ کچھ دائیاں اور عملے کے دیگر افراد بھی اِدھر اُدھر بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ مہرن نے پرچہ بنوایا اور دونوں کو لے کر لیڈی ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ لیڈی ڈاکٹر نے پہلے تو انیس کی بیوی کی نبض دیکھی پھر 'چیک اَپ' کے لیے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ اسی کمرے میں ایک جانب ایک لمبی سی میز پڑی ہوئی تھی جس پر اس نے انیس کی بیوی کو لیٹنے کو کہا اور میز کے برابر ایک لمبا سا ہرے رنگ کا پردہ کھینچ دیا۔ دس منٹ کے بعد وہ باہر نکلی اور صابن سے ہاتھ دھونے کے بعد اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کوئی خاص بات نہیں ہے۔ تم لوگ فکر مت کرو۔ میں کچھ دوائیں لکھ دے رہی ہوں، اسے کھلاتی رہو اور پندرہ دنوں کے بعد مجھ سے پھر ملو۔ اس کی ڈی. این. سی. کرنی ہوگی۔'' انیس کی چچی اور مہرن اس انداز سے ''ہاں، ہوں'' کرتی رہیں جیسے وہ سب کچھ سمجھ رہی ہوں۔ باہر نکلتے ہی انیس کی چچی نے مہرن سے دریافت کیا۔

''ڈکٹرنیا کا کرے کے کہت رہی ہو؟ ہمری تَ کچھو سمجھ میں نا آوا۔'' وہ کافی اوبی اوبی سی لگ رہی تھی۔

''سمجھ میں تَ ہمریو نا ہیں آوا ہو۔ ہوے سکت ہے کہ سایت کچھ سپھائی او پھائی کرے۔'' وہ تینوں برآمدے سے گزر رہی تھیں کہ ایک کمرے سے کسی عورت اور ایک بچے کے چیخنے کی آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں۔ لڑکا چیخ چیخ کر رو رہا تھا اور عورت اسے مار مار کر گالیاں بکتی جا رہی تھی۔ حالانکہ چچی کا دل وہاں پر ٹھہرنے کو ایک دم نہیں چاہ رہا تھا مگر مہرن نے نہ صرف اس کمرے میں جھانکا بلکہ یہ کہتی ہوئی اندر بھی داخل ہو گئی کہ ''کا بھوا ہو نگینا، ای تُہرے بٹوا کے کا بھوا۔ ایکے کاہیں پلستر لگ رہا ہے؟'' مہرن نے ہمدردی جتاتے ہوئے سوال کیا۔

''کچھ ناہیں ہو۔ ای سوور کا جنا، ہئی ے ہے حرامی۔ چلے رہیں سکر ڈنڈی

کھیلے۔ پیڑ پر سے گر پڑا اور ہاتھ ٹٹ گوا۔'' اتنا کہتے کہتے اس نے اپنے بیٹے کو ایک تھپڑ اور جڑ دیا۔ ''مرونا ہیں جاتن کہ پھول پھاتیہا کر کے سبُر کر دے ای............! اچھا اور کہو مہرن، ہیاں تُرا آنا کئی سے بھوا؟'' اس کا دھیان لڑکے کی طرف سے ہٹ گیا۔

کونو کھاس بات ناہیں ہے ہو۔ رجا بھائی کی پتوہ کا دکھاوے لاے رہے۔ انیس کی اموں آئی ہیں۔'' مہرن نے نگینہ سے آنے کا سبب بتایا۔ عام طور پر انیس کی والدہ کے علاوہ اس کی چچی اور بڑی ماں بھی انیس کی ماں ہی کہی جاتی تھیں۔

''تبو، کا بات ہے؟'' نگینہ نے دلچسپی ظاہر کی۔

''جانچ کراوے لاے رہے۔ ڈاگڈرنی دوائی لکھ دہس ہے اور پندرہ دنا باد پھر بلائس ہے۔ سائد سپھائی او پھائی کرے۔'' مہرن نے وضاحت کردی۔

''ارے، تَ ہمّے کا ہے ناہی بتایو۔ ہم یہیں نوکری کری تھے اور سب ڈاگڈر ڈاگڈرنی ہمری بڑی اجتو کرے تھیں۔'' نگینہ نے شکایتاً کہا۔

''ایما نراج ہوے کی کونو جرورت نا ہے۔ بس ای سمجھ لیو کہ ہم لون بڑی جلدی میں رہے۔ ایسا کرو کہ تو سام کے رجا بھائی کے گھر چلی آؤ اور دلہن کا لیا وے لے جاے کی جِمے داری اپنے اُپّر لے لو۔ چلو، ہم انیس کی اماں سے توری بات کرائے دے ای۔'' اور مہرن نگینہ کے ہمراہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ گیلری میں پڑی ہوئی ایک بوسیدہ کی بنچ پر انیس کی چچی بیٹھی ہوئی اس کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ قریب پہنچ کر اس نے نگینہ کا تعارف کرایا اور دونوں کے درمیان تھوڑی سی رسمی گفتگو بھی ہوئی۔ پھر انیس کی چچی نے کہا۔

''بہت ابیر ہوگئی ہو۔ اب چلے کا چاہی۔ انیس کے ابا کے آوے کا ٹیم بھی ہو گوا ہے۔'' نگینہ بھی اخلاقاً انھیں چھوڑنے باہر نکل آئی۔ ابھی وہ لوگ ہسپتال کے احاطے سے گزر ہی رہے تھے کہ مہرن یک بیک چیخ پڑی۔

''ارے نگینہ......دیکھو، دیکھو، گو، گو، اررر ے........! مگر اس کا چیخنا چلانا یکسر بیکار ثابت ہوا۔ نگینہ پھرتی سے اُچھلنے کے باوجود اپنا پورا بایاں پیر چپ سے پاخانے پر رکھ چکی تھی۔

''دھت تری کی۔ ذ کا جنی کونے کے ہی جا بھوا رہا جون اپنا لڑیکا ہیاں ہگائے رہی۔ توبا، توبا۔ بے طرح بڑ گیے ہو۔'' نگینہ مٹی اور گھاس پر اپنا پیر رگڑ رگڑ کر صاف کرنے کی ناکام کوشش کے ساتھ اس نادیدہ کو گالیاں بھی بکے جا رہی تھی جس کی وجہ سے اسے آج یہ ذلت اور شرمندگی اٹھانی پڑی تھی۔ اس شرمندگی کی وجہ سے اس کا موڈ اتنا زیادہ خراب ہو گیا تھا کہ اس نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ ہسپتال کا صدر دروازہ بھی آچکا تھا۔ اتفاق سے انھیں ایک یکہ بھی وہیں کھڑا مل گیا۔ جب تینوں اس پر سوار ہو گئیں تو نگینہ پانی کی تلاش میں ہسپتال کی طرف چل دی۔ وہ غسل خانے سے اپنا پیر دھو کر ابھی باہر نکلی ہی تھی کہ ہسپتال کے ایک ملازم نے اسے بڑے ڈاکٹر سے ملنے کو کہا تو وہ سیدھے ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ ڈاکٹر، جو کسی فائل میں الجھا ہوا تھا، اس سے متوجہ ہو کر غصے سے بولا۔

''دیکھو نگینہ، اب میں تم کو وارننگ دے رہا ہوں کہ اگر ایک ماہ کے اندر دو کیس اور نہیں دیے تو تمھارا پرمانٹ ہونا تو دور، بہت ممکن ہے کہ تمھاری تنخواہ بھی روک دی جائے۔'' ڈاکٹر کے فیصلہ کن انداز سے نگینہ ڈر گئی اور گڑگڑا کر کہنے لگی۔

''مگر سرکار ہم تَ پانچ کیس پہلے ہی دے چکے ہیں جبکہ ہے کھالی چار ے ٹھے کیس دینا رہا۔'' اور ڈاکٹر نے فائل بند کرتے ہوئے گھُڑک کر کہا۔

''بکواس بند کرو۔ جب بھی تم سے کیس کے لیے کہتا ہوں 'پانچ کیس، پانچ کیس' کی رٹ لگا دیتی ہے۔ ایک مرتبہ پھر سے کان کھول کر سن لو۔ تم کو کل آٹھ کیس دینا ہے اور اگر تم اپنی نوکری پکی کروانا چاہتی ہو تو ایک مہینے کے اندر دو کیس اور لاؤ ورنہ......! اب تم جا سکتی ہو۔'' بڑے ڈاکٹر نے اُسے جھڑک دیا۔

وہ بڑبڑاتی ہوئی ڈاکٹر کے کمرے سے باہر نکل آئی کہ "پانچ ٹھو کہن رہا، اب آٹھ ٹھو ہوے گوا۔ پرمانٹ نہ کری ہیں اور تنکھا ہو روک دے ہیں۔ جبر امارے، روے نہ دے۔ گھدا گارت کرے، ای پتہ نہیں کون سرکار آئی ہے کہ نس بندی کا کیس دیو تب تنکھاہ ملی"۔ یہی سب بڑبڑاتے ہوے وہ اس کمرے کی طرف چل دی جہاں اس کے بیٹے کے ہاتھ پر پلاسٹر لگایا جا رہا تھا۔

ہسپتال میں پہلی ملاقات کے بعد نگینہ کا انیس کے گھر آنا جانا کافی بڑھ گیا تھا۔ وہ گھر اور باہر کے چھوٹے موٹے کام بھی کر دیا کرتی تھی۔ اُس کی اس خدمت کے عوض انیس کے گھر سے اکثر اسے کھانے اور کپڑے لتے کے علاوہ دس پانچ روپے بھی مل جایا کرتے تھے اور اس بڑے گھر میں اس کی جو اہمیت تھی وہ الگ۔

نگینہ کیوٹانے سے لکھیا کے ساتھ بہت خوش لوٹی تھی۔ اس نے لکھیا کو نس بندی کروانے کے لیے نہایت آسانی سے ہموار کر لیا تھا۔ اسے ساری، پیتل کے برتن اور روپے کا لالچ بھی دیا، جس سے وہ انپڑھ شاید نابلد تھی۔ اس نے لکھیا کو اپنے گھر بٹھایا اور یہ سوچ کر انیس کے گھر جا پہنچی کہ شاید اس کی بیوی بھی آج ہسپتال جاے۔ اس نے انیس کی والدہ کو بتایا کہ آج پندرہ دن پورے ہو چکے ہیں اس لیے ڈکٹرائن نے بلایا ہے۔ اگر چلنا ہے تو تیار ہو جاؤ۔ یہ سن کر انیس کی والدہ نے بہو کو تیار ہونے کی ہدایت دی اور خود بھی ان کے ساتھ چلنے کی تیاری کرنے لگیں۔ مگر نگینہ کے یہ کہنے پر کہ انیس کی دلہن بھی میری بٹی جیسی ہے، انھیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر دل چاہے تو چلیے ویسے وہ بغیر کسی پریشانی کے، تنہا انیس کی دلہن کو دکھالاے گی۔ نگینہ کی اپنائیت دیکھ کر انھوں نے بہو کے ساتھ خود جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور نگینہ کے ہاتھ پر سو روپے کا ایک نوٹ رکھتے ہوے اسے ہدایت دی کہ "بہو کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنا" اور نگینہ ان سے وعدہ کر کے بہو کو ساتھ لے کر باہر نکل گئی۔

انیس کی بیوی کے علاج کو تین برس گزر چکے تھے۔اس دوران ملک کے ساتھ اس کے گاؤں میں بھی بڑے انقلاب آئے۔ پنچایت کا الکشن ہوا۔ نیا پردھان منتخب ہوا۔ چک بندی ہوئی۔ کلوا ناؤ کا بڑا بیٹا کمانے کے لیے سعودیہ چلا گیا ہے۔ سیکڑوں چھوٹے کسانوں کے اپجاؤ کھیتوں کو پیر لگ گیے۔ کتنے بے زمین لوگ کھیتیہروں کے فہرست میں داخل ہو گیے اور کتنوں کی زمینیں ان کے ہاتھوں سے اس طرح نکل گئیں کہ وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکے۔ متعدد جھوپڑوں کی جگہ پر اب پختہ مکان نظر آرہے ہیں۔ کتنے کچے مکانوں کی جگہ پر ادھ گری مٹی کی دیواریں ہی رہ گئی ہیں۔ اسی گاؤں کے ایک وکیل صاحب نے اپنی ناپسندیدہ بیوی کو پھکنی سے مار مار کر مار ڈالا۔ سیکڑوں گھروں میں نہ جانے کتنے بچے پیدا ہوے اور نہ جانے کتنے لوگوں کو قضا کھا گئی۔ کسی نے لڑکے کی ولادت پر مٹھائیاں تقسیم کیں تو کئی لوگ لڑکی کی ولادت پر غمگین اور مضمحل نظر آئے۔ کتنے ہی شیر خوار ابھی ماؤں کی گودیوں میں ہمک رہے ہیں، کتنے گھٹنیوں چلنے لگے ہیں اور کتنے ہی تتلا کر بولنے بھی لگے ہیں مگر انیس اور اس کے گھر والوں پر اس انقلاب کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ اس کے گھر والے آج بھی وارث کی آس میں درگاہ درگاہ مارے پھر رہے ہیں۔ آخر کار آج انیس کی بڑی ماں نے سب کو اپنا یہ فیصلہ سنا دیا کہ وہ بہو کو لے کر شہر جا رہی ہیں تا کہ کسی بڑے ڈاکٹر سے مشورہ کر سکے۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق وہ اگلے ہی دن انیس اور اس کی بیوی کو لے کر شہر چلی گئیں اور پتہ لگا کر شہر کے سب سے بڑے گائنا کولاجسٹ سے ملیں۔ تھوڑی دیر تک جانچ کرنے کے بعد گائنا کولاجسٹ اندرونی کمرے سے برامد ہوئی۔ خلاف معمول اس کا چہرہ غصے سے تمتمایا ہوا تھا۔ چند لمحہ تو وہ انیس اور اس کی بڑی ماں کو گھور کر دیکھتی رہی پھر جھنجھلا کر بولی۔ ”ایک ڈاکٹر کے ساتھ مذاق کر کے اس کا قیمتی وقت ضائع کرتے آپ لوگوں کو شرم نہیں آتی۔“

''مگر جناب، ہم لوگوں کا قصور کیا ہے؟ بھلا ہم گاؤں دیہات کے لوگ آپ سے مذاق کیوں کرنے لگے؟'' وہ کچھ بوکھلائے ہوئے سے تھے۔

''یہ مذاق نہیں تو اور کیا ہے، برسوں پہلے تم لوگ اس لڑکی کی نس بندی کروا چکے ہو اور اب مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ اسے بچہ کیوں نہیں ہوتا۔'' ڈاکٹر نے دونوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

''کک کیا.....؟ نس بند.....بندی.....! اتنا کہتے کہتے انیس کی بیوی کو چکر آ گیا اور اس کی بڑی ماں سر تھام کر وہیں زمین پر بیٹھ گئیں۔ انیس ایکدم ٹھگا ٹھگا سا کبھی اپنی بیوی کو دیکھتا تو کبھی لیڈی ڈاکٹر کو۔

●

گاگرُ ٹیلے کا اِمام باڑہ

انسانی ناموں کے تعلق سے اکثر و بیشتر یہی دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر لوگوں کے نام ان کی شخصیت یا خصوصیات سے قطعی منفی ہوتے ہیں۔ کہاوت بھی مشہور ہے کہ 'پڑھے نہ لکھے، نام محمد فاضل'۔ ہر چند کہ بچوں کے نام اکثر گھر کے بزرگ یا پھر والدین طے کرتے ہیں مگر انسانی کردار کے تعلق سے بچوں کے منفی نام رکھنے کے سلسلے میں انھیں قصوروار قطعی نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیوں کہ اولاد کے نام کی تجویز کا براہ راست تعلق والدین کے جذبات سے ہوتا ہے۔ اکثر والدین کئی بچوں کے نام کے انتخاب میں قافیہ پیمائی کو بھی فوقیت دیتے ہیں جس کے نتیجہ میں اکثر بچوں کے نام مہمل اور کبھی کبھار مضحکہ خیز تک ہو جایا کرتے ہیں۔ ہمارے محلے کے ایک شخص کو خداوند کریم نے جب مسلسل چار بیٹوں سے نوازا تو وہ اُن کو للّن، کلّن، الّن اور جھلّن کے ناموں سے پکارنے لگا۔ ہو سکتا ہے کہ ان چاروں بھائیوں کے کوئی اصل نام بھی رکھے ہوں اور یہ پکارنے والے نام ہوں۔ اگر یہ حقیقت بھی ہو تو بھی محلے پڑوس یا گھر خاندان والے تو درکنار، ان چاروں بھائیوں کو بھی اپنے اصل ناموں کا علم نہیں تھا۔ محلے کے بزرگوں کا کہنا ہے کہ ان کے جداعلیٰ اسی ضلع کے کسی دوردراز گاؤں سے آ کر یہاں پر پناہ گزین کی حیثیت سے ایک لاوارث زمین پر آباد ہو گیے تھے۔ اُن صاحب کا اصل نام اصغر تھا مگر کوئی انھیں اُگّر صاحب کہہ کر مخاطب کرتا تھا کوئی گگّر۔ جب زمین کے مالک کو یہ اطلاع ملی کہ ان کے احاطے پر گگر نامی کوئی شخص بمع اہل و عیال آ بسا ہے تو اس نے انھیں بُلا بھیجا۔ زمین مالک نے اپنی زمین پر بغیر ان کی اجازت قیام پر گھُڑک کر اعتراض کا مظاہرہ کیا تو بڑے میاں نے زمین مالک کے پیر پکڑ

لیےاور بات کرائے داری پر طے ہوئی۔ دس روپے ماہ وار۔ دونوں خوش تھے۔ زمین کے مالک کی نظروں میں جنگل جھاڑیوں جیسا ویران سا احاطہ اور بے سہارا کرائے دار کی نگاہوں میں دو بیگھے زمین۔ احاطے کے کسی کونے میں اُدھ گری خام دیواروں پر گھاس پوس کے چھپر اور کسی کونے میں ٹن شڈ ڈال لیا گیا۔ بچی ہوئی فالتو زمین کو مسطح کر کے اس پر دھڑلے سے سبزی کی کاشت بھی کی جانے لگی۔ کھانے سے زاید سبزی کو موقع بے موقع فروخت کر کے تھوڑی بہت کمائی بھی کر لی جاتی تھی۔ دیکھتے دیکھتے زمین کا یہ غیر آباد اور ویران ٹکڑا آباد ہی نہیں بلکہ سرسبز وشاداب بھی نظر آنے لگا۔ زمانے کے ساتھ اس احاطے والوں نے تھوڑی بہت ترقی کر لی تھی۔ پڑھائی لکھائی میں نہیں کیونکہ اس معاملے میں تو یہ لوگ لکیر کے فقیر تھے۔ بسم اللہ شریف کے بعد کچھ دنوں تک اردو۔ تھوڑا بہت ٹیں، ٹاں کرنے لگے اور خود کو علامہ تصور کر کے درسی کتب بند کر دی۔ اس خاندان میں ہر کسی کے کثیر الاولاد، اور اولادوں میں بیشتر لڑکا ہونے کے سبب جلد ہی ان کی پڑھائی لکھائی چھڑا کر کسی کام سے لگا دیا جاتا۔ اس کے باوجود غربت اور افلاس جیسے ان کی زندگیوں کے اہم جزو بن گیے تھے۔ دیکھتے دیکھتے اس گھر کے جداعلیٰ گگر عرف 'گاگر صاحب' نے اپنے اخلاق سے ہر کسی کو اس حد تک گرویدہ کر لیا کہ محلے پڑوس میں ان کی عزت کافی بڑھ گئی تھی۔ پھر گاگر صاحب کے نام کی نسبت سے آہستہ آہستہ زمین کا وہ ٹکڑا 'گاگر ٹیلہ' کہا جانے لگا چنانچہ گاگر صاحب اور اس کے خاندان کا ہر فرد گاگر ٹیلہ کو اپنی اجارے داری تصور کرنے لگا۔

تقریباً پچاس برسوں کے بعد جب یہ شہر ترقی کے سدرہ تک جا پہنچا تو زمین کی قیمت بھی آسمان سے باتیں کرنے لگیں تو زمین کے مالک نے گاگر ٹیلہ والوں کو اپنی زمین سے بے دخل کرنا چاہا۔ اس دوران گاگر صاحب اللہ میاں کو پیارے ہو چکے تھے۔ اب اس خاندان کی باگ ڈور گاگر صاحب کے سب سے بڑے پوتے مولا بخش

عرف مُولائی کے ہاتھوں میں تھی، جو عام طور پر مُولی کہا جاتا تھا۔ مولی چونکہ مجلس ماتم کا شوقین تھا اس لیے اس نے گھر کے ایک کمرے کو امام باڑہ میں تبدیل کر لیا تھا۔ سال بھر تو یہ کمرہ بند رہتا مگر محرم کا چاند نمودار ہوتے ہی اس کمرے میں علم استادہ کر دیئے جاتے اور حسب حیثیت گھر والے ہی مل جل کر مجلسیں بھی کر لیا کرتے تھے۔ یہ مجلسیں عام طور پر گاگرٹیلہ والے ہی کر لیا کرتے تھے مگر ان میں کبھی کبھار محلے پڑوس والے بھی شرکت کر لیا کرتے تھے۔ کثیر الاولاد ہونے کے سبب مفلسی، بھکمری اور پھٹے حال رہنا ان کا مقدر بن چکا تھا مگر کثیر الاولاد ہونا مولی کے لیے بڑا سودمند ثابت ہوا۔ مولی اور اس کی اولادیں اپنے مزدوری کے زمانے سے گدّی داروں سے اپنا خون چُسواتے چُسواتے اب مزدوروں کے خون چوسنے کا گُر بخوبی سیکھ چکی تھیں۔ بقول شخصے اب مولی گدّی والا سیٹھ بن بیٹھا تھا۔ اچانک بے شمار دولت آ جانے کی وجہ سے مولی نے خود میں چند نوابی عادات و اطوار بھی پیدا کر لیے تھے۔ آرام طلبی، شانداری اور بات بات پر مصاحبوں کو انعام دینا اور چھوٹی موٹی غلطیوں پر مادر خواہر بھی اس کے ورد زبان ہوتا۔ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود ایک ایسی کسک اس کے دل میں باقی تھی جس نے اس کے دن کا چین اور رات کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ خلش یہ تھی کہ گاگرٹیلے کا علاقہ اب تک کاغذی لحاظ سے اس کا نہیں ہو سکا تھا۔ گاگرٹیلہ والے، جو کہ اب اپنے نام سے بجلی اور پانی کے کنکشن حاصل کرنے کے بعد اس زمین کے اس ٹکڑے کو اپنی اجارہ داری تصور کرنے لگے تھے، بھلا شرافت سے کب ماننے والے تھے۔ بے دخلی کے تعلق سے زمین مالک سے بات تو تو، مَیں مَیں کی سرحدوں سے گزر کر مقدمے بازی کی منزل تک بآسانی جا پہنچی، جو گاگرٹیلہ والوں کے لیے بہر صورت اطمینان بخش تھا۔ اطمینان بخش اس لیے کہ گاگرٹیلے کی زمین اب ان لوگوں سے آسانی سے خالی نہیں کرائی جا سکتی تھی۔ دیوانی کا مقدمہ تھا چنانچہ تیس چالیس برس کھنچ جانا کوئی خاص بات نہیں تھی۔ مگر زمین مالک، گاگرٹیلہ والوں کی سوچ سے کافی آگے نکل گیا

تھا۔ سال گزرتے گزرتے درجنوں پیشی ہوگئی اور مقدمے میں ایسے ایسے پیچ پڑے کہ مولی کو اپنی شکست کے آثار صاف نظر آنے لگے تو اس نے آج خود وکیل سے مل کر اسے ایک ایسا نقطہ سمجھایا کہ وکیل نے دل کھول کر اس کی تعریف کی۔

''وکیل صاحب، آپ جج صاحب سے کہیے کہ گاگرٹیلہ کے احاطے میں ایک امام باڑہ بھی ہے اس لیے یہ کرائے داروں کے پاس ہی رہنا چاہیے۔ اگر امام باڑہ غیر شیعہ حضرات کے ہاتھوں میں چلا گیا تو اس کی بے حرمتی ہو سکتی ہے، جو اس شہر کی شیعہ برادری کو ہرگز برداشت نہ ہوگا اور بات دنگے فساد تک بھی پہنچ سکتی ہے۔'' مولی نے ہانپ ہانپ کر وکیل صاحب کو امام باڑے کی اہمیت سے آگاہ کرایا تو اس نے خوش ہو کر کہا۔

''واہ مولی سیٹھ، واہ۔ آپ کی یہ ترکیب تو صدفی صد کامیاب رہے گی اور جج صاحب اس نقطے پر خاص طور سے متوجہ ہوں گے۔ میری طرف سے پیش گی مبارک باد قبول فرمایئے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ فیصلہ آپ کے حق میں ہو کر رہے گا۔ مگر آپ کو کچھ ایسا ضرور کرنا ہوگا کہ اس امام باڑے کی شہرت شہر بھر میں ہو جائے۔ کسی طرح اس امام باڑے کو ایسی شہرت دیجیے کہ شہر بھر کے لوگ اس سے بخوبی واقف ہو جائیں پھر دیکھئے گا، یہ پورا گاگرٹیلہ کیسی آسانی سے آپ کا ہو جاتا ہے۔'' وکیل صاحب نے صلاح دی تو مولی نے کہا۔

''آپ اس کی فکر نہ کیجیے وکیل صاحب۔ اس امام باڑے کی شہرت کا کوئی نہ کوئی راستہ میں نکال ہی لوں گا۔'' اس نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا اور وکیل سے رخصت لے کر گھر کی طرف چل دیا۔ وہ راستے بھر امام باڑے کی شہرت کے لیے طرح طرح کی ترکیب سوچتا رہا مگر کسی خاص نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا۔ رات کا کھانا کھا چکنے کے بعد جب وہ بستر پر لیٹا تب بھی کافی عرصہ تک اِسی اُدھیڑ بُن میں الجھا رہا کہ اس امام باڑے کو شہر بھر میں شہرت کیسے دلائی جائے مگر کسی خاص نتیجہ تک پہنچنے سے قبل نیند نے اسے اپنی آغوش

میں لے لیا۔

اگلی صبح جب وہ سو کر اُٹھا تو اُس کے آگے ایک نئی مصیبت منھ پھیلائے کھڑی تھی۔ ہُوا یہ کہ اس کے ایک چچا اس گھر کے جس حصے میں رہتے تھے اسے وہ خالی کر کے اپنے بیٹے کے ہمرا اُس سرکاری کواٹر میں جا بسے تھے جو اُس کے بیٹے کو اس ڈپارٹمنٹ کی جانب سے ملا تھا جہاں اسے نوکری مل گئی تھی۔ گاگر ٹیلہ کے اپنے حصے کے دو کمروں کو انھوں نے کسی غیر شیعہ کرایہ دار کو دے دیا تھا۔ جب اس کے چچا آج صبح ایک کرائے دار کے ہمراہ گھر میں اِس غرض سے آئے کہ وہ اپنے حصے کے کمروں کو کرایہ دار کے سپرد کر دیں تو مولی کی اس کے چچا کے ساتھ کافی بحث و مباحثے کے ساتھ تکرار بھی ہوئی مگر آخر میں جیت چچا کی ہی ہوئی اور کرایہ دار یہ کہتا ہوا چچا سے کمروں کی چابی لے کر چلتا بنا کہ وہ کل سے یہیں آ کر رہے گا۔ کرائے دار کے ہمراہ چچا اسے ایک اور فکر میں ڈال کر چلتے بنے۔

چچا کے چلے جانے کے بعد گاگر ٹیلہ کے پورے خاندان والوں کے درمیان اچھی خاصی پنچایت ہوئی اور آخر میں یہ طے پایا کہ ان کرایہ داروں کو کسی بھی صورت یہاں ٹِکنے نہیں دیا جائے گا۔ اور ہوا بھی یہی۔

دوپہر کے ایک بجے ہوں گے کہ چھ افراد پر مشتمل کرائے داروں کا ایک کنبہ بے روک ٹوک دندناتا ہوا گاگر ٹیلہ کے احاطے میں گھس آیا اور چچا میاں والے کمروں کا تالا کھول کر اس میں اپنے سامان منتقل کرنے لگا۔ ابھی وہ سب اپنے سامان ان کمروں میں پوری طرح سِٹ بھی نہیں کر پائے تھے کہ یکے بعد دیگرے، گاگر ٹیلہ کے ہر کمرے کا دروازہ کھلا اور ان میں سے جوق در جوق مرد، عورتیں، لڑکے، لڑکیاں چیختے چلّاتے نئے کرائے داروں پر جھپٹ پڑے۔ کرائے داروں کو چونکہ اس طرح کے اچانک حملے کی توقع نہیں تھی اس لیے وہ سب گھبرا گیے۔ اس ہنگامہ آرائی کے دوران مولی کا ایک بھتیجا، جس کا نام عباس تھا، اس نے امام باڑے میں گھُس کر استادہ علموں کے پٹکے، پھریرے اور

پنجے نوچ نوچ کر امام باڑے میں بکھیرنے کے ساتھ آنگن میں بھی پھینکنا شروع کر دیا۔ ایک کونے میں ہمیشہ خاموش بیٹھی رہنے والی مولی کی بوڑھی دادی بھی اس قضیے میں کود پڑی اور کچھ سوچے سمجھے بغیر کرایہ دار کی عوتوں سے بھڑ گئیں تھیں۔ اس دھینگا مُشتی میں بوڑھی دادی خود پر قابو نہ رکھ سکیں اور لڑکھڑا کر گر گئیں۔ اب ان پر جو غصے کی کیفیت طاری ہوئی تو انھوں نے نزدیک پڑی ہوئی ایک لکھوری اینٹ اُٹھا کر اس سے اپنے سر پر بے تحاشہ تین چار ضربیں لگالیں۔ دیکھتے دیکھتے ان کا چہرہ لہولہان ہو گیا تو مولی چیختا ہوا ان کی طرف جھپٹا۔

"ارے دادی اماں، آپ کو ظالم یزیدیوں نے مارا۔ ان سبھوں نے علم کی بھی بے حرمتی کی۔ چلیے، فوراً ہمارے ساتھ پولس تھانے چل کر ان سبھوں کے خلاف رَپٹ لکھوائیے۔" اور وہ انھیں سہارا دے کر صدر دروازے کے طرف بڑھ گیا۔

مولی کے اس قدم پر کرائے دار بڑی طرح سے بوکھلا گیے تھے۔ ان لوگوں نے یہاں سے فوراً نو دو گیارہ ہو جانے میں ہی عافیت محسوس کی اور وہاں سے نکل لیے تو گاگر ٹیلہ والوں نے اپنی فتح کے احساس کے ساتھ چین کا سانس لیا۔

مولی کی دادی کے ہمراہ پولس میں رپورٹ لکھوانے کے آدھے گھنٹے کے اندر ایک جیپ میں بھر کر پولس کے جوان گاگر ٹیلہ آدھمکے۔ ان کے ساتھ چند پریس والے بھی تھے جو دَنادَن ہر ہر زاویہ سے امام باڑے اور آنگن میں بکھرے ہوئے علم کے پٹکوں، پنجوں اور پھریروں کی تصویریں اتارنے لگے۔ ان لوگوں نے گاگر ٹیلہ کے باشندوں کے ساتھ زخمی بڑھیا کی بھی چند تصویریں کیمروں میں قید کر لیں۔ آناً فاناً میں پولس اور اخبار والوں کے لیے بہترین ناشتے پانی کا بھی انتظام کر لیا گیا۔ مولی سے خوش ہو کر انھیں میں سے کسی ایک نے اسے یہ صلاح بھی دی کہ "دادی جی کا علاج کسی پرائیوٹ نرسنگ ہوم میں کروانے کے بجائے انھیں فوراً کسی سرکاری ہسپتال میں لے جائیے اور کوشش کر کے

ڈاکٹر سے ان کی میڈیکل رپورٹ بھی بنوا لیجیے۔ یہ مقدمے کے سلسلے میں کورٹ میں بہت کام آئے گی۔ اور ہاں، اگر وہاں کچھ خرچ برچ بھی کرنا ہو ہچکچایئے گا نہیں۔'' اور تمام کاروائی آدھے گھنٹے کے اندر مکمل ہو گئی۔

مولی نے پہلی فرصت میں وکیل کو بھی فون کر کے بلا لیا تھا۔ ساری باتیں سننے اور موقع معائنہ کرنے کے بعد وکیل نے بھی مولی کی حاضر دماغی کے ساتھ کی گئی کاروائی کی خوب تعریفیں کی اور یہ کہتے ہوئے اس سے اجازت لی کہ ''مولی سیٹھ، اللہ آپ پر بہت مہربان ہے۔ سب کچھ بڑی آسانی سے آپ کے حق میں ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔'' وکیل اسے تعریفی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

''ارے وکیل صاحب ابھی آپ نے کیا دیکھا ہے۔ اب تو گاگرٹیلہ کے اس گمنام امام باڑے کے بارے میں روز خبریں شائع ہوں گی۔ دیکھ لیجیے گا۔'' وکیل کو لگا کہ مولی ابھی خاموش نہیں بیٹھے گا بلکہ کچھ اور بڑا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے چنانچہ وہ مولی سے اس کا آئندہ کا پروگرام دریافت کیے بغیر ہی چل دیا۔ مولی نے موقع کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے چچا جان کے دونوں کمروں پر بھی اپنا تالا جڑ دیا۔

ایامِ عزا کے دوران کسی امام باڑے کی ایسی بے حرمتی کی خبر سن کر اس شہر کے تمام مسلمان ایک دَم سے بھڑک اُٹھے تھے، جنھیں بڑی مشکلوں سے پولس اور گاگرٹیلے والوں کی مدد سے سمجھا بجھا کر قابو میں کیا جا سکا تھا۔ جس روز یہ حادثہ پیش آیا تھا، اسی دن سے پرشاسن نے پولس کے دو مسلحہ سپاہی گاگرٹیلہ امام باڑے کی حفاظت کے لیے تعینات کر دیئے تھے۔ اپنے گھر پر مسلح پولس والوں کا پہرہ دیکھ کر گاگرٹیلہ والے اپنی شخصیت میں کافی وزن محسوس کرنے لگے تھے۔

گاگرٹیلہ امام باڑے پر آٹھویں محرم کی مجلس پورے شباب پر تھی کہ اچانک اپنی جگہ سے اُٹھ کر مولی کے بھتیجے عباس نے زور زور سے ماتم کرتے ہوئے ضریح کی طرف

اشارہ کر کر کے ''ہائے مولیٰ، ہائے مولیٰ......وہ دیکھیے، دُلدل اور نہر فرات کی شبیہ دکھائی دے رہی ہے، ہائے مولیٰ عباس'' کی کربناک آوازیں نکالنے لگا جسے دیکھ کر امام باڑے میں اکٹھا سارا مجمع پیٹ پیٹ کر ماتم کرنے لگا۔ ہر طرف ''گاگر ٹیلے کے امام باڑے میں معجزہ ہوگیا، معجزہ ہوگیا'' کا شور بلند ہوگیا۔

گاگر ٹیلے کے امام باڑے میں معجزہ ہوجانے کی خبر سینہ بہ سینہ روئی کی آگ کے مانند آن کی آن میں پورے شہر میں پھیل گئی۔ کسی نے علم پر شبیہ دیکھی تو کسی نے دُلدل کی، کسی نے نہر فرات دیکھی تو کسی نے ضریح اور علم پر تازہ خون کے دھبے۔ اسی روز شام ہوتے ہوتے پورا شہر گاگر ٹیلہ کے امام باڑے کی زیارت کے لیے اُمنڈ پڑا۔ شیعہ عوتوں اور مردوں کا جو غول بھی یہاں آتا وہ زیارت کے ساتھ مجلس کرتا اور تبرک بھی تقسیم کرتا۔ ہر کوئی اپنی بساط کے مطابق چڑھاوے چڑھاتا اور منتیں بھی مانتا تھا۔ ضریح کے ایکدم قریب مولی خود بیٹھا زائرین کے تبرکات نذر کرتا اور چڑھاوے قبول کرتا۔ ایکدم کسی منجھے ہوئے پرانے متولی کے مانند۔ زائرین میں ہر کوئی ضریح اور تمام علموں کو اس خیال کے ساتھ غور سے دیکھتا کہ شاید اسے بھی مولیٰ کی زیارت نصیب ہوجائے۔ غور سے دیکھنے والوں میں جو لوگ اچانک ہائے مولیٰ، ہائے مولیٰ، کہہ کر چیخ اُٹھتے، سمجھیے انھیں مولیٰ نے زیارت دے دی اور جو یہ کہتا ہوا مایوسی کے ساتھ باہر نکل آتا کہ اُسے کچھ بھی نظر نہیں آیا تو موجودہ زائرین میں بیشتر افراد اسے بدقسمت تصور کرتے۔ زائرین میں زیادہ تر لوگوں کو مولی کا بھتیجہ، عباس، ہی معجزہ دکھاتا تھا۔ وہ امام باڑے کے صحن میں کھڑا، بس ضریح کو ایک ٹک دیکھے جاتا تھا۔ جو لوگ اس کے ارد گرد کھڑے ہوتے، وہ ضریح اور علم کی طرف اپنی کلمہ اُنگلی سے اشارے کر کر کے انھیں بتاتا ''وہ دیکھیے....وہ کسی بچی کی شبیہ، وہ ذوالجناح....وہ نہر دکھائی دے رہی ہے۔'' اور کچھ لوگ اس کی ہاں میں ہاں بھی ملاتے۔ آٹھویں محرم سے لے کر عشرے تک یہی سب کچھ کثرت سے چلتا رہا۔ اس

معجزے کی رپورٹنگ لوکل اخبارات میں بھی بڑے اہتمام سے شائع ہوتی تھی۔ عشرے کے بعد لوگوں کا آنا جانا پہلے کے مقابلے کچھ کم ہو گیا تھا مگر یہ سلسلہ بند نہیں ہوا تھا۔ مولی اب دن رات امام باڑے اور زائرین کی خدمت میں ہی لگا رہتا۔ چونکہ اسے دوسرے کسی کام کی فرصت نہ تھی اس لیے مقدمے بازی سے متعلق تمام کام اس نے اپنے سب سے بھروسہ مند، پرانے اور وفادار نوکر 'جیجل' کے سپرد کر دیے تھے۔ جیجل کا اصل نام عزیز الحسن تھا، جو اب جیجل ہو چکا تھا۔ اس میں اب کسی تبدیلی کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ہر معاملے میں مولی کو سب سے زیادہ تقویت اسی نوکر سے پہنچی تھی جو اصل معنی میں مولی کا مصاحب تم چمچہ بن بیٹھا تھا۔ اپنی مصاحبت کی بنا پر ہی جیجل، مولی کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اس کی حد درجہ مصاحبت سے خوش ہو کر مولی اکثر اسے انعام و اکرام سے بھی نوازا کرتا تھا۔ اپنی آرام طلبی، خود ساختہ نوابی شان اور اپنی عدیم الفرصتی کے سبب مولی نے اِس مقدمہ کی تمام تر ذمہ داریاں جیجل کو سونپ کر پورے طور سے امام باڑے اور زائرین کی خدمت میں لگ گیا تھا۔ پولس اور عدالتوں کے چکر سے بچنے کے لیے مولی نے احاطے کی طرف سے مقدمے کے تمام کاغذات جیجل کے نام سے ہی تیار کروائے تھے۔ جیجل کی ان خدمات کے عوض، اُس کے کنبہ کی پرورش کا ذمہ خود مولی نے اٹھا لیا تھا۔ جیجل کو چونکہ کوئی اور کام نہیں آتا تھا، سوائے اس کے کہ وہ مقدمہ کی پیروی میں عدالتوں اور وکلا کے گھروں کے چکر لگائے اور حسب ضرورت مولی کی چمچہ گیری کرتا رہے۔ ایک سفلہ مزاج نوکر کو بھلا اور چاہیے بھی کیا۔

جیجل آج مولی کے حق میں احاطہ مالک کے جانب سے ایک ایسی دل خوش کن خبر لایا تھا جس پر مولی کو بڑی مشکل سے یقین آیا تھا۔

''مولی سیٹھ، مبارک ہو۔ بہت بہت مبارک ہو۔'' یہ سن کر مولی اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور جیجل سے سوال کیا۔

"آخر کچھ بتاؤ گے بھی کہ کیا بات ہے یا بس مبارک باد ہی دیئے جاؤ گے؟"

مولی نے عجلت کا مظاہرہ کیا۔

"بس یہ سمجھ لیجیے کہ شرفا کا حق کوئی بہت دنوں تک نہیں مار سکتا۔ آخر کار احاطے کے مالک نے آپ کے حق میں آج ایک بہت اچھی تجویز پیش کی ہے۔ اس کی تجویز صدفی صد آپ کے فائدے کی ہے۔" اس نے اب تک تجویز کا ماحصل تک نہیں بتایا تھا۔ اس طرح اُس کا وزن مولی کی نگاہ میں بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔

"ارے جیجل بھائی جلدی بتایئے۔ میرے دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی ہے۔ آپ تو کافی تھکے تھکے سے نظر آ رہے ہیں۔" اور مولی نے اس کے لیے ناشتہ لانے کا حکم دیا۔

"اس لڑائی جھگڑے اور معجزے کے ساتھ امام باڑے کی بڑھتی مقبولیت کے سبب احاطہ مالک خاصا مضمحل اور بجھ سا گیا ہے۔ آج جب میں اس کے گھر کے قریب سے گزر رہا تھا تو اس نے مجھے آواز دے کر روک لیا اور کہا کہ وہ اس مقدمے بازی سے بہت تھک گیا ہے اس لیے احاطے کے سلسلے میں کوئی حتمی فیصلہ چاہتا ہے۔ جب میں نے اُس سے وضاحت چاہی تو کہنے لگا کہ اگر مولی سیٹھ کو منظور ہو تو میں اماباڑے سمیت آدھا احاطہ اُن کے نام بعوض ۳۰ رلاکھ روپے میں رجسٹری کر دوں گا بشرطیکہ آدھے احاطے پر مولی بھائی مجھے قبضہ دے دیں۔ اس سمجھوتے کا سب سے سودمند پہلو یہ ہے کہ رجسٹری شدہ زمین کی قیمت ۳۰ رلاکھ روپے، احاطہ مالک دکھاوے کے طور پر تو جج صاحب کے سامنے قبول کر لے گا مگر عدالت سے باہر نکلتے ہی فوراً وہ رقم آپ کو واپس کر دے گا۔" جیجل نے ایک سانس میں ساری تفصیل مولی کو بتا دی۔ یہ سن کر مولی خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس درمیان جیجل کے لیے پھلوں، مٹھائیوں اور قیمتی بسکٹ سے مرصع ناشتہ کی سینی آ چکی تھی اور وہ کسی تکلف کے بغیر اس پر ٹوٹ پڑا۔

طے شدہ دن اور تاریخ کے مطابق آج ایک اہم سمجھوتے کے تحت احاطے کے مقدمے کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ مولی، جیجل کے توسط سے آج کرائے دار سے اصل معنی میں زمین دار بننے والا تھا۔ مولی نے ہزار ہزار روپے کے نوٹوں کی گڈیاں ایک جھولے میں احتیاط سے رکھ کر اسے جیجل کے حوالے کر دی۔ اس کا صدقہ نکال کر اسے خدا حافظ کہا۔ کاغذات اور سمجھوتے کے مطابق آدھے احاطے کی رجسٹری جیجل کے نام ہوگئی اور اُس نے روپیہ بھی جج صاحب کے سامنے احاطے کے مالک کے حوالے کر دیا جو کہ وعدے کے مطابق احاطے کے مالک نے عدالت سے باہر نکلتے ہی جیجل کو واپس بھی کر دیا۔ یہ اطلاع جیجل نے مولی کو اس کے موبائل پر دے دی۔

''ہاں، ہلو مولی سیٹھ۔ بہت بہت مبارک ہو۔ سارا کام اسکیم کے مطابق ہو گیا۔ میں رجسٹری کے کاغذات لے کر پہنچ رہا ہوں۔ شاید دیر بھی ہو جائے۔ اپنے گھر ہو کر آؤنگا۔ احاطے کا مالک جا رہا ہے۔ اسے مٹھائی وغیرہ کھلا دیجیے گا اور آدھی زمین پر قبضہ بھی دے دیجیے گا۔ میں واپس آ کر زمین کے کاغذات اور تیس لاکھ روپے آپ کے حوالے کر دوں گا۔ ابھی یہ زمین، جو کہ میرے نام ہے، آپ کے نام ٹرانسفر کروانی ہے۔ وکیل صاحب سے اس سلسلہ میں مشورہ بھی تو کرنا ہے۔'' جیجل نے جلدی جلدی ساری باتیں مولی کو بتائیں تو وہ خوشی سے جھوم اٹھا اور جیجل سے صرف اتنا ہی کہا۔

''بہت بہت شکریہ جیجل بھائی۔ آپ کا یہ احسان میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ شاید میرا سگا بھائی بھی میرے لیے اتنا نہ کرتا۔ آپ سارے کام نمٹا کر آرام سے آئیے گا۔ میں آپ کی صلاح کے مطابق احاطہ مالک کو آدھی زمین پر فوراً قبضہ دے دونگا۔ اچھا، خدا حافظ۔'' اور جیجل نے مسکرا کر موبائل فون آف کر دیا۔

آج پندرہ دن کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی جیجل، اب تک مولی سے ملنے نہیں آیا تھا۔ نہ تو اس نے مولی کو تیس لاکھ روپے ہی واپس کیے نہ ہی رجسٹری شدہ زمین

کے کاغذات ہی اسے دکھاے۔ پندرہ دن گزر جانے کے بعد آج مولی کو جیجل کی طرف سے ایک عدالتی نوٹس موصول ہوئی۔ اس عدالتی نوٹس کے مطابق جیجل کی زمین پر مولی نے جبراً قبضہ کر رکھا تھا جبکہ یہ زمین ابھی پندرہ روز قبل ہی جیجل نے احاطہ کے مالک سے بعوض تیس لاکھ روپے نقد، خریدی تھی۔ نوٹس دیکھ کر مولی کے قدموں تلے سے زمین کھسک گئی اور آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اس کے منھ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا۔

جس روز سے مولی پر جیجل کی جانب سے اس زمین کو ناجائز طور پر ہتھیا لینے کا مقدمہ شروع ہوا ہے، مولی پر دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔ اس کے بچوں نے اُسے شہر کے سب سے بڑے نرسنگ ہوم میں داخل کروا دیا ہے۔ گاگر ٹیلے کے امام باڑے میں ہوے معجزے کا اثر اب عوام کے دلوں سے تقریباً جا چکا ہے کیونکہ اپنا الو سیدھا کرنے کی غرض مولی کی جانب سے معجزے کی جھوٹی افواہ سے اب پورا شہر بخوبی واقف ہو چکا ہے۔

●

سبک دوش

عام طور پر یہی دیکھا گیا ہے کہاوتیں اور محاورے ہر کس و ناکس کو پسند ہوتے ہیں۔اس کی خاص وجہ،اس کا موقع بہ موقع من وعن صادق آنا ہے۔شارب بھی انگریزی کی اس کہاوت "Plan your work,Work you plan" سے ازحد متاثر تھا چنانچہ اس نے اس انگریزی کہاوت کو اپنی زندگی کی صراحت میں شامل کرلیا تھا۔شاید اسی وجہ سے نپی تلی زندگی گزار رہا تھا۔ جب اس کا رٹائرمنٹ قریب آیا تو وہ بہت مطمئن تھا،اس لیے کہ اس نے رٹائرمنٹ کے بعد کی زندگی بھی پلان کرلی تھی۔پشتینی گھر تھا۔بیٹی کی شادی کر چکا تھا، جو خوش حال زندگی گزار رہی تھی۔ بیٹا موٹی عقل والا مگر بی.اے.کا طالب علم تھا۔اگر نوکری مل گئی تو واہ، اگر نہ ملی تو اُسے وکالت پڑھا دے گا۔کم از کم وکیل صاحب کہا تو جائے گا۔پھر اس کی شادی بیاہ کے فرائض سے سبک دوش ہو کر بیوی کے ساتھ حج بیت اللہ اور زیارت مقام مقدسہ کے لیے چلا جائے گا۔ پنشن اتنی ملے گی کہ آئندہ پوری زندگی سکون سے گزر جائے گی اور بس.....!

شارب نے چونکہ کوئی دوست نہیں بنایا تھا اس لیے اسے کسی کی دشمنی کا بھی خدشہ دور دور تک نہیں تھا۔اب اسے انتظار تھا تو اپنے رٹائرمنٹ تک بیٹے کے برسرروزگار ہونے کا۔اس نے اپنے بیٹے نجیب کے لیے اپنے رشتے کی ایک بھتیجی کو پسند بھی کر رکھا تھا۔پسند ہی نہیں بلکہ لڑکی والوں کو زبان بھی دے دیا تھا۔اس نے ایسا صرف اس لیے کیا تھا کہ اُسے اپنے سید ہونے پر بڑا فخر تھا،اسی لیے وہ بیٹے کی شادی بھی سادات گھرانے میں ہی کرنے کا خواہاں تھا۔اب اسے انتظار تھا تو بیٹے کے برسرروزگار ہونے کا۔

نجیب عموماً شام کو گھر دیر سے لوٹا کرتا تھا۔ شروع شروع میں تو شارب نے اس سے پوچھ تاچھ کی۔ جب اس نے والدین کو یقین دلا دیا کہ وہ سوائے دوستوں کے، کہیں اور نہیں جاتا تو انھوں نے پوری سادگی سے بیٹے کی بات پر یقین کر لیا۔ مگر اِدھر کچھ دنوں سے اُسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ نجیب گھر واپسی میں کچھ زیادہ ہی تاخیر کرتا ہے تو آج اس نے نجیب کو پھر ٹوکا۔

''کیوں جی نجیب، آج کس دوست کے گھر گیے تھے جو واپسی میں شب کے ساڑھے گیارہ بج گیے؟'' آج نجیب کی طرف سے اس کے ذہن میں کچھ زیادہ ہی برے بھلے خیالات سر اٹھا رہے تھے۔

''کچھ نہیں پاپا، آج وحید کے گھر رک گیا تھا۔ اس سے گذشتہ برس کے امتحان کے پرچے لینے تھے، اسی وجہ سے دیر ہو گئی۔'' اس نے اتنی جلدی جواب دیا کہ جیسے اسے اندیشہ رہا ہو کہ آج اس سے باز پرس ضرور ہوگی اور اس نے جواب پہلے سے ہی سوچ لیا تھا۔

''خیر، آئندہ خیال رہے کہ زیادہ سے زیادہ رات کے نو بجے تک گھر ضرور واپس آجایا کرو۔'' انھوں نے تاکید کی تو نجیب نے حامی بھرتے ہوے کہا۔

''جی پاپا، بہت اچھا۔ میں خیال رکھوں گا۔'' اس نے بظاہر تو باپ کو مطمئن کر دیا تھا مگر شارب کو نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے نجیب اس سے جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے بیٹے کے روز بروز گھر میں تاخیر سے آنے کے سلسلے میں بیوی سے بھی بات کی مگر اس نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

''جوان لڑکا ہے، بی. اے. میں پڑھ رہا ہے، چار دوست یار ہوں گے، انھیں کے ساتھ گھومنے پھرنے میں دیر ہو جاتی ہوگی۔''

''مگر مجھے اس کا گھر سے زیادہ دیر تک باہر رہنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ پچھلے

برس تک تو ٹھیک تھا۔ میں اُس کے تمام دوستوں سے بخوبی واقف تھا مگر اس سال، جب سے اس کا نام بڑے کالج میں لکھوایا گیا ہے، وہ کچھ زیادہ ہی اُڑا اُڑا سا رہتا ہے۔'' شارب نے ناگواری کا اظہار کیا۔

''تو کیا، اس کے پیچھے ڈنڈا لے کر گھومو گے۔ نجیب اب ایک دم سے بچہ تو رہا نہیں۔ ماشااللہ سترہ برس کا ہو گیا ہے۔ اگر زیادہ سختی کی تو وہ باغی بھی ہو سکتا ہے۔ میں اس کے مزاج سے بخوبی واقف ہوں۔ اس لیے وقتاً فوقتاً سمجھا بُجھا دینا ہی کافی ہوگا۔'' اس کی بیوی نے کہا تو شارب خاموش ہو گیا مگر اُسے نجیب کی طرف سے اطمینان ہرگز نہیں تھا۔

ایک روز نجیب نے، ماں سے یہ کہہ کر دس ہزار روپیوں کی فرمائش کی کہ اس کے کچھ دوست گھومنے کی غرض سے دہلی جا رہے ہیں، وہ بھی اُن کے ساتھ جانا چاہتا ہے تو اس کی ماں نے اسے دبی زبان سے منع کیا مگر جب اس نے ضد کی تو ماں نے کہا کہ اچھا میں تیرے والد سے بات کروں گی۔ جب اُنھوں نے نجیب کے دہلی جانے کے تعلق سے شارب سے بات کی تو انھوں نے سختی سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں، نہیں۔ اِس چھوٹی عمر میں اس کا گھومنا ٹہلنا اگر اسی طرح بڑھتا رہا تو دیکھ لینا کہ پڑھائی لکھائی سے اس کا دل ایک دم ہٹ جائے گا۔ وہ تو یوں بھی تھوڑے بیوقوف قسم کا لڑکا ہے۔ اسے تو کوئی بھی آسانی سے بہکا سکتا ہے۔ میں مناسب نہیں سمجھتا۔'' ان کا لہجہ بہت سخت تھا۔

''آپ بھی نہ، پتہ نہیں کس زمانے میں سانس لے رہے ہیں۔ ارے لڑکا ماشا اللہ جوان ہو گیا ہے۔ کالج میں بڑے دنوں کی چھٹیاں ہونے والی ہیں۔ اگر چار دوستوں کے ساتھ ہفتے، عشرے کے لیے گھومنے ٹہلنے کی غرض سے دہلی جانا چاہتا ہے تو اس میں غلط بھی کیا ہے۔ اگر ابھی سے دنیا نہیں دیکھے گا تو آگے چل کر طرح طرح کے اونچ نیچ کیسے سمجھ سکے گا۔ کیا اسے تمام عمر پلو سے باندھ کر رکھو گے......؟ ایک ہفتے کی بات ہے۔ میں تو

کہتی ہوں کہ اسے جانے کی اجازت دے دو۔اس طرح ہر بات میں پابندی لگانا ٹھیک نہیں۔ مجھے جو کہنا تھا کہہ دیا،اب جیسی تمھاری مرضی۔''اور بیوی نے اسے ہموار کرلیا۔

نجیب گھر سے تو ایک ہفتہ کہہ کر نکلا تھا مگر آج جب بارہ دنوں کے بعد بھی اس کی واپسی نہیں ہوئی تو دونوں میاں بیوی اس کی طرف سے خاصے فکرمند ہو گیے۔زیادہ فکر کی بات یہ تھی کہ اس دوران دہلی سے اس کا ایک بھی فون نہیں آیا تھا۔شارب جب بھی اسے فون کرتا تو اس کا موبائل بند پاتا تو شارب اس کی طرف سے فکرمند نظر آنے لگا تھا۔اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب وہ کرے کیا۔کافی غور وخوض کے بعد اس نے بیوی سے دریافت کیا کہ وہ کن دوستوں کے ہمراہ گیا ہے تو وہ بھی کچھ نہ بتا سکی۔اس دوران شارب اس کے کئی پُرانے دوستوں کے گھر بھی گیا مگر اس کے دوستوں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو اسے نجیب کے بارے میں کچھ بتا سکتا۔اس طرح جب دوروز اور گزر گیے تو بیٹے کی طرف سے ان کے دلوں میں طرح طرح کے برے خیالات سر اُٹھانے لگے۔آخر کار شارب نے پولس کو اطلاع دینے کی ٹھان لی۔ پولس چوکی جانے کی غرض سے ابھی وہ کپڑے تبدیل ہی کر رہا تھا کہ اچانک اس کے موبائل فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ یہ فون نجیب کے موبائل سے کیا گیا تھا مگر دوسری جانب سے بولنے والا نجیب نہیں بلکہ کوئی اور تھا۔

''ہلو....!''شارب نے کہا تو موبائل سے ایک انجانی سی آواز آئی۔

''انکل، میں نجیب کا دوست بول رہا ہوں۔نجیب کی طرف سے مجھے آپ سے کچھ خاص باتیں کرنی ہیں۔''اُدھر سے آواز آئی۔

''تم کون ہو اور نجیب کہاں ہے؟''شارب نے سوال کیا۔

''میرا نام رام کمار شری واستوا ہے، انکل۔نجیب بھی یہیں پر ہے مگر وہ آپ سے بات کرنے میں ڈر رہا ہے، اس لیے مجھ سے کہا ہے آپ سے بات کروں۔''ایک انجانے آدمی کے منھ سے ایسے غیر متوقع کلمات سن کر شارب کا دل ڈر گیا۔ یہ نہ جانے کون

شخص ہے اور نجیب کی طرف سے پتہ نہیں کیا کہنا چاہتا ہے۔ ویسے اسے اتنا اطمینان تو ہو ہی گیا تھا کہ اس کا بیٹا جہاں کہیں بھی ہے، خیریت سے ہے۔

''ٹھیک ہے بولو، تم اس کی طرف سے کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''انکل آپ ناراض مت ہوئیے گا۔ بات دراصل یہ ہے کہ نجیب نے ایک لڑکی سے شادی کر لی ہے۔'' یہ سن کر تو جیسے شارب کا دل ہی بیٹھ گیا۔

''کیا کہا؟ شادی.....! نجیب نے شادی کر لی ہے۔ کب اور کس سے؟ وہ لڑکی کون ہے، اس کا نام کیا ہے اور وہ کہاں کی رہنے والی ہے؟'' شارب نے ایک ساتھ کئی سوال کیے تو اس نے پھر کہا۔

''بِملا نام کی اس لڑکی سے نجیب کا پرِیچے فیس بک پر ہوا تھا۔ اس لڑکی کے ماں باپ نہیں ہیں انکل۔ وہ لڑکی بہت دُکھی ہے۔ اسے اپنا لیجیے تو بڑا پُن ہوگا انکل، اناتھ ہونے کے کارن اس کی شادی نہیں ہو رہی تھی، اسی کارن اس لڑکی کی عمر تیس برس ہو گئی تھی۔ جب نجیب نے اسے اپنا.....''

''خاموش......بیہودے۔ میں اس قسم کی لڑکیوں اور تم جیسے لوگوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ میرے نابالغ بیٹے کے ساتھ جو کھیل تم لوگوں نے کھیلا ہے اس کا اندازہ مجھے اچھی طرح سے ہو گیا ہے۔ میرا نجیب ابھی نابالغ ہے۔ میں فوراً پولس کے ساتھ دہلی پہنچ رہا ہوں۔ میں تم لوگوں کی ساری چالیں ناکام کر دونگا۔ نجیب اناتھ نہیں ہے.....!'' شارب کی چیخ سن کر اس کی بیوی بھی وہیں آ گئی تھی۔

''انکل میں نے کیا کیا ہے......اس میں میرا کیا قصور ہے؟ نجیب کے کہنے پر میں نے تو بس آپ کو اطلاع دی ہے۔ اور پولس......نہیں انکل......!'' اور گھبرا کر اس لڑکے نے فون بند کر دیا۔ اس کی بیوی شارب سے کچھ پوچھتی، اس کے قبل اس نے کہنا شروع کیا۔

''دہلی سے نجیب کے کسی آوارا دوست کا فون تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ نجیب نے بملا نام کی کسی تیس برس کی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ فیس بک پر دونوں کی جان پہچان ہوئی تھی...... یا اللہ......! سارا قصور تمھارا ہے۔ جب بھی میں نے نجیب کے لیے سخت قدم اٹھانے کی کوشش کی، تم نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا۔ سب سے پہلی غلطی تو تم نے اسے موبائل فون دلوا کر کی۔ وہ ہر وقت موبائل سے الجھا رہتا تھا تب بھی تمھاری سمجھ میں نہیں آ سکا کہ آخر وہ دن رات موبائل لیے کیا کرتا رہتا ہے۔ جب بھی میں نے یہ سب جاننا چاہا، تم نے ہی مجھے مغالطے میں رکھا کہ 'گیم کھیلتا ہے'۔ کاش میں نے تم پر یقین نہ کیا ہوتا تو آج یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ کاش......'' اتنا کہہ کر وہ پاس میں پڑی ہوئی ایک کرسی پر اپنا سر تھام کر بیٹھ گیا۔

●

خادمہ کی تلاش

وہ زمانہ اور تھا جب وہ گھر بھی صاحب حیثیت کی فہرست میں شمار ہوتا تھا جس میں تمام کنبے کو دووقت کی روٹی آسانی سے میسر آجاتی تھی۔ غربت کے ساتھ ساتھ جہالت کا بھی یہ عالم تھا کہ بیشتر صاحب حیثیت اشخاص کے دروازوں پر بن بلائے خادموں اور خادماؤں کی بھرمار ہوتی تھی۔ غریب اور پسماندہ طبقے کے مرد 'میاں صاحب' کی کوٹھیوں کی بیٹھکوں میں اور ان کی عورتیں زنان خانوں تک پہنچ کر صرف اِس آس میں ان کی خدمات انجام دیا کرتے تھے کہ شاید کچھ بھلا ہوجائے۔ اور اس خدمت کی انھیں اُجرت بھی ملا کرتی تھی۔

خدا کے فضل وکرم سے اب ہمارے ملک اور عوام نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ ماشا اللہ، ہر محنتی شخص بآسانی عزت سے اپنے کنبے کی کفالت کرلیتا ہے۔ پہلے کے مقابلے بچے کم ہوتے ہیں۔ آج بہت سے ایسے کنبے بھی ہیں جہاں میاں بیوی دونوں برسر روزگار ہیں۔ اسی سبب بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلا رہے ہیں اور خوش حال ہیں۔ ایسے کنبے کا کام ملازم کے بغیر تو چل جاتا ہے مگر ایک عدد خادمہ کے بغیر ایسے کنبوں کا کام مشکل سے ہی چلتا ہے۔ جنھیں قسمت سے ایک عدد معقول خادمہ مل جاتی ہے، محلے پڑوس والے اور رشتہ دار، ان کی قسمت پر رشک کرتے ہیں۔ اس قسم کا تقریباً ہر کنبہ ایک معقول خادمہ کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے مگر کامیابی ذرا مشکل سے ہی مل پاتی ہے۔ ایسے ضرورت مند حضرات کو اکثر بے ایمان نوکروں کے ہاتھوں دھوکا کھاتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے، پھر بھی خادموں کی چاہت میں کمی نظر نہیں آتی۔

محمد نوروز علی بھی آج مہینوں سے ایک عدد ایسی خادمہ کی تلاش میں تھا جو اس کی بیوی بچوں کے ہمراہ گھر میں ہی رہے۔ گھریلو کام کاج، بچوں کی دیکھ بھال اور بازار سے روزمرہ کے سامان لائے اور ایماندار ایسی ہو کہ وقتاً فوقتاً گھر کی ذمہ داریاں بھی بے فکری کے ساتھ اس کے سپرد کی جاسکیں۔ نوروز نے اپنے حلقۂ احباب سے لے کر محلے پڑوس اور خاندان کے ہر فرد کو اپنی اس ضرورت سے گوش گزار کرا دیا تھا مگر اب تک اسے کامیابی نہیں مل سکی تھی۔ آج اس کے دفتر کے ایک ساتھی نے اسے ایک خادمہ کے متعلق خبر دی تو وہ خوشی سے اچھل پڑا۔

''آج آپ نے بہت اچھی خبر سنائی ہے مشرا جی۔ اب یہ بتائیے کہ اس خادمہ سے آپ مجھے کب ملا رہے ہیں؟'' نوروز نے عجلت کا مظاہرا کیا۔

''ایسا ہے کہ کل اتوار کی چھٹی ہے۔ میں اسے کل اپنے ساتھ لے کر آپ کے گھر آؤں گا۔ بہت معقول عورت ہے۔ اس میں چند ایسی خوبیاں ہیں کہ جس کی بنا پر کوئی بھی اسے اپنے ساتھ رکھنے کے لیے بخوشی راضی ہو جائے گا۔ مثلاً، ایماندار ہے، بچوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتی ہے، لذیذ پکوان کی ماہر ہے اور ساتھ رہنے کو بھی تیار ہے۔ کھانے کپڑے کے علاوہ صرف تین ہزار روپے ماہوار لے گی اور بس۔'' مشرا نے اپنے دوست، نوروز سے اس خادمہ کی سنی سنائی تمام تعریفیں بیان کر دیں تو نوروز نے جلدی سے کہا۔

''تیرا بہت بہت شکریہ یار مشرا۔ اب تو جلدی سے اسے لے کر میرے گھر آ جا۔ میں کل بے صبری سے تیرا انتظار کروں گا۔ مگر ایک بات تو بتا کہ جب وہ اتنی اچھی اور معقول عورت ہے تو اسے پرانے مالکوں نے چھوڑا کیوں؟''

''تمھارا سوال نہایت معقول ہے نوروز۔ تمھاری جگہ پر کوئی بھی ہوتا تو یہ سوال ضرور کرتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ وہ رہتی تھی وہ لوگ امریکہ جا کر

وہیں پر بس گیے ہیں۔ وہ لوگ تو بہت چاہتے تھے کہ یہ ملازمہ بھی ان لوگوں کے ہمراہ امریکہ چلے مگر وہ راضی نہیں ہوئی۔ بس اس میں ایک کمی یہ ہے کہ.....!'' مشرا نے کہا تو نوروز نے دریافت کیا۔

''کمی.....کیسی کمی؟ ذرا وضاحت کر دیتے تو بہتر ہوتا۔''

''کوئی خاص بات نہیں، بس پڑھی لکھی نہیں ہے۔''

''ارے تو اس میں کیا پرابلم ہے یار۔ عام طور پر گھروں میں کام کرنے والی خادمائیں جاہل ہی ہوا کرتی ہیں۔ پھر مجھے اس کی پڑھائی لکھائی سے کیا لینا دینا ہے۔ ہاں اگر پڑھی لکھی ہوتی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ بہر حال میں کل تیرا انتظار کروں گا۔''

یہ خبر جب نوروز نے اپنی بیوی کو سنائی تو وہ بھی بہت خوش ہوئی۔ اس کی باتوں سے بھی یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ اگر خادمہ پڑھی لکھی ہوتی تو اسے زیادہ خوشی ہوتی۔ پھر بھی دونوں کو شدت سے کل کا انتظار تھا۔

دوسرے روز تقریباً گیارہ بجے نوروز کا دوست مشرا، اس کے گھر آیا تو اسے دیکھ کر دونوں بہت خوش ہوے۔ وعدے کے مطابق مشرا اپنے ساتھ اس عورت کو بھی لایا تھا۔ اُسے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کوئی انپڑھ یا جاہل گنوار ہوگی۔ اس کے کپڑے، رکھ رکھاو اور بات چیت سے تو یہ اندازہ قطعی نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کسی۔ کے گھر کی ملازمہ ہوگی۔ زبان نہایت صاف ستھری۔ وہ ہر جملے میں انگریزی کے ایکادھ لفظ ضرور بولتی تھی۔ نوروز کا اندازہ تھا کہ وہ دیکھاوے کے لیے بات چیت کے درمیان انگریزی کے الفاظ نہیں۔ ستعمال کرتی بلکہ ایسا وہ عادتاً کرتی ہے۔ نوروز نے سوچا، ایسا اس لیے ہے کہ آج سے قبل بھی وہ ایک ایسے آدمی کی خادمہ تھی جو ابھی حال میں امریکہ جابسا ہے۔ ظاہر ہے وہ کنبہ بھی پڑھا لکھا ضرور رہا ہوگا شاید اسی لیے یہ بھی باتوں کے درمیان انگریزی کے عام الفاظ کثرت سے استعمال کرتی ہے۔ اس کی تنخواہ وغیرہ تو نوروز کو مشرا نے پہلے ہی بتا دی

تھی اس لیے اب کسی مزید تفصیل کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔نوروز کی بیوی نے اپنے دونوں بچوں کا تعارف نئی خادمہ سے کرانے کے بعد اُسے اُس کا کمرہ دکھاتے ہوئے آج آرام کرنے کو کہا۔

''آج تو تم آرام ہی کرو۔ابھی فی الحال کوئی کام نہیں ہے۔''اور وہ اپنا صندوق وغیرہ لے کر اس کمرے میں چلی گئی جو نوروز کی بیوی نے اسے دکھایا تھا۔

ایک من چاہی خادمہ مل جانے کے سبب چونکہ نوروز کی بیوی بہت خوش تھی اس لیے اس نے نوروز سے فرمائش کی کہ آج سنڈے کی چھٹی ہے اس لیے کہیں گھومنے چلتے ہیں۔گھومنے کا ذکر سن کر بچے بھی خوش ہو گیے۔جب خادمہ نے سنا کہ دونوں میاں بیوی، بچوں کے ہمراہ سیر کے لیے باہر جا رہے ہیں تو اس نے نوروز کی بیوی سے کہا۔

''بی بی جی، آپ لوگ ضرور جایئے اور گھوم ٹہل آیئے۔اس طرح بچے بھی خوش ہو جائیں گے۔شام کو جب آپ لوگ لوٹیے گا، آپ کو ڈِنر تیار ملے گا۔بس مجھے صرف اتنا بتا دیجیے کہ آج ڈِنر میں آپ لوگ کیا کھانا پسند کریں گے؟''نوروز کی بیوی نے اُسے رات کے کھانے کے متعلق ہدایت دینے کے بعد کہا۔

''ذرا میری بیٹی کے کمرے میں چلی جاؤ اور اس کی الماری سے نارنجی رنگ کا سوٹ نکال کر مجھے دے دو۔سامنے ہی رکھا ہے۔تمھیں تلاش نہیں کرنا پڑے گا۔''خادمہ، بچی کا کپڑا نکالنے کی غرض سے اس کے کمرے میں گئی تو نہ آج واپس آ رہی ہے نہ کل۔ جب اسے بچی کے کمرے میں گیے ہوئے تقریباً پندرہ منٹ گزر گیے تو نوروز کی بیوی نے اسے آواز دی۔

''تم اتنی دیر سے بیٹی کے کمرے میں کیا کر رہی ہو؟ ابھی تک تمھیں اس کا کپڑا نہیں ملا کیا۔؟''

''نہیں بی بی جی، وہ سوٹ تو کہیں دکھائی ہی نہیں دے رہا ہے۔آپ نے کہیں

اور تو نہیں رکھ دیا ہے؟'' اس نے کہا تو نوروز کی بیوی خود کمرے میں آئی اور الماری سے نارنجی رنگ کا سوٹ اُٹھا کر خادمہ کو دکھاتے ہوئے ذرا تیز آواز میں کہا۔

''یہ دیکھو، نارنجی رنگ کا سوٹ سامنے ہی پڑا ہے اور تم نے ساری الماری کے کپڑے اُتن ڈالے۔ بیوقوف، جاہل......! سامنے ہی پڑا ہوا نارنجی سوٹ تمھیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔'' وہ سوٹ لے کر پلٹی تو نوروز بھی اس کمرے تک آ چکا تھا۔ اُس کے جواب میں خادمہ نے اُلٹے نوروز کی بیوی کو موردالزام ٹھہراتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

''تو ایسے کہنا چاہیے تھا کہ 'آرنج کلر' والا سوٹ لاؤ۔ آپ بھی تو پتہ نہیں کیا نارنجی، نارنجی کہے جا رہی تھیں۔'' اتنا کہہ کر خادمہ رات کا کھانا پکانے کی غرض سے باورچی خانے کی طرف چل دی اور دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے اور باہر جانے کی تیاری کرنے لگے۔

●

دور کا ڈھول......!

ثباتی اپنے والدین کی اِکلوتی اولاد تھی۔اس کے والد کا انتقال ان کی شادی کے چھ ماہ کے بعد ہی ہو گیا تھا۔ثباتی کی والدہ پر اتنی بڑی مصیبت ٹوٹنے کے بعد دستور کے مطابق گھر، خاندان، اپنوں، پرایوں، برادری، سماج سے ہمدردی کے عوض اس کے حصے میں منحوس اور سبز پیری جیسے خطاب آئے، جسے اس نے صبر وتحمل کے ساتھ برداشت کیا۔ خیر خواہوں کے کافی زور دباو کے باوجود وہ دوسری شادی کے لیے تیار نہیں ہوئی۔اس نے اپنی تمام تر توجہ ثباتی کی تعلیم وتربیت کی طرف مرکوز کر دی تھی۔وارث کے ناوقت انتقال کے باعث اسے اپنے چھوٹے سے کنبے کی کفالت کے لیے سخت محنت مزدوری کرنی پڑتی تھی، جسے اس نے قسمت کا لیکھا مان کر قبول کر لیا تھا۔گھر یلو تعلیم اور اچھی تربیت کے ساتھ اس نے ثباتی کا داخلہ گاؤں کے ایک اسکول میں کروا دیا تھا۔ثباتی بذات خود چونکہ کافی ذہین لڑکی تھی اس لیے دیکھتے دیکھتے اس نے اِنٹر کا امتحان امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کر لیا۔اُسے آج انٹر کی مارک شیٹ لینے کے لیے اسکول جانا تھا۔مارک شیٹ ہی نہیں بلکہ اسے اسکول سے نام کٹوانے کا فارم بھی لینا تھا۔مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے کسی بڑے کالج میں داخلے کے لیے نہیں بلکہ ماں کے حکم پر فوراً شادی کرنے کے لیے۔ گاؤں سے ہی رشتہ آیا تھا۔لڑکا امریکہ میں کوئی اچھی نوکری کرتا تھا۔جب ثباتی نے جلدی شادی کے عوض مزید تعلیم کی خواہش ظاہر کی تو ماں نے یہ کہہ کر اُسے ہموار کر لیا کہ ''ہم جیسے مفلس لوگوں کے گھروں کی بیٹیوں کو بھلا اچھا گھر گھرانا ملتا کہاں ہے۔یہ تو تیری خوش قسمتی ہے جو لڑکے والے بغیر کسی 'خواہش' کے صرف نکاح پر راضی ہو گیے ہیں اور شادی کر

کے لڑکا تجھے اپنے ساتھ امریکہ لے جائے گا۔'' ہر چند کہ ثباتی اپنی شادی کے تعلق سے جلد بازی کے خلاف تھی مگر ماں کی ضد کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔

اسکول پہنچنے کے بعد حسب عادت ثباتی کی آنکھیں حیدر کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے دیکھا کہ حیدر مسکراتا ہوا اُسی طرف چلا آرہا ہے تو وہ ایک درخت کے نیچے رُک گئی۔ حیدر نے اس کے قریب پہنچ کر آہستہ سے سوال کیا۔

''تم نے کیا فیصلہ لیا ثباتی؟'' وہ کچھ اداس اداس سا، اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''جس روز سے امی نے میرا رشتہ ابراہیم نام کے کسی آدمی کے ساتھ ٹھہرایا ہے، میری سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیت ہی سلب ہوگئی ہے۔ دل جو چاہتا ہے، وہ کرنے کی اجازت ضمیر نہیں دیتا۔ اگر میں گھر چھوڑ کر تمھارے ساتھ فرار اختیار بھی کرلوں تو ایک نہ ایک روز پکڑے جانے کا خدشہ لاحق ہے...... اس کے بعد کی بے عزتی تم ہرگز برداشت نہیں کر سکتے، جو میرے لیے بھی نہایت تکلیف دہ ہوگا۔ میں تمھیں کسی بھی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی حیدر۔ بس تم زندہ اور سلامت رہو تا کہ میں تمھیں دیکھ تو سکوں.....!'' اتنا کہتے کہتے اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

یعنی میں خاموشی سے دیکھتا رہوں اور میری ثباتی کسی دوسرے کی ہو جائے۔ صرف اپنی عزت بچانے کے لیے میں تمھیں کھودوں۔ کیا یہی تمھارا بھی فیصلہ ہے؟'' اس کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو رہا تھا۔

''ہاں حیدر۔ میری عقل تو یہی کہہ رہی ہے۔ عزت سے بڑھ کر بھلا دنیا میں اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ اگر ناگزیر ہو تو عزت پر جان کو بھی صدقہ کر دینا چاہیے۔ قسمت کے اس فیصلے کو خدا کی مرضی مان کر صبر کرلو۔ یا یہ مان لو کہ میں بھی یہی چاہتی ہوں، اس لیے کہ میں امی کی حکم عدولی نہیں کر سکتی۔ اگر تم مجھے صدق دل سے چاہتے ہو تو میرے لیے اپنی

ثباتی کے لیے، ایک دم خاموشی اختیار کرلو۔ اس سلسلے میں تمھاری خاموشی.....مجھ پر تمھارا احسان ہوگی۔'' اتنا کہتے کہتے اس کی آواز بھرّا گئی۔ ضبط کے باوجود اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگیے۔ ثباتی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر حیدر ایک دم سے بے چین ہوگیا۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُسی کی وجہ سے ثباتی کو دُکھ پہنچا ہے۔ اُس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''نہیں ثباتی، تم روؤ مت۔ میں تمھاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا، خواہ وجہ کچھ بھی ہو۔ مجھ پر مہربانی کر کے خاموش ہوجاؤ۔ وہی ہوگا، جو تم چاہوگی۔ تمھاری ہر صلاح میرے نزدیک حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ میں خاموشی کے ساتھ برداشت کرلوں گا، اُف تک نہ کروں گا۔ تمھارے لیے، اپنی ثباتی کے لیے۔'' حیدر کے اصرار پر ثباتی نے رونا تو بند کردیا تھا مگر اس کی سسکیاں اب بھی جاری تھیں۔ وہ سسکتے ہوئے آگے بڑھی اور حیدر کے دونوں ہاتھ، اپنے ہاتھوں میں لے کر پہلے تو آنکھوں سے لگایا پھر بوسہ دینے کے بعد کہا۔

''حیدر، تم نے آج یہ مجھ پر دوسرا بڑا احسان کیا ہے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمھارے دونوں احسانات کی قیمت زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں ضرور ادا کروں گی۔'' وہ خاموش تھی مگر اس کی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔

''دو احسانات......! دوسرا کون سا؟ میں سمجھا نہیں۔'' وہ ثباتی کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''دوسرا تو یہی ہے حیدر کہ تم نے خاموشی کے ساتھ صبر کا وعدہ کیا۔ اور پہلا احسان......تم نے مجھ سے محبت کر کے مجھ پر کیا ہے۔ مجھ لاوارث کو تحت الثریٰ سے اُٹھا کر سدرۃ المنتہیٰ پر بٹھا دیا۔ مجھ سے محبت کر کے تم نے مجھے فخر کے لائق بنا دیا ہے حیدر۔ تم نے مجھ سے عشق کر کے مجھے جن بلندیوں تک پہنچا دیا ہے، اُسے شاید میرے سوا کوئی اور محسوس ہی نہیں کرسکتا........خدا حافظ حیدر......خدا حافظ میری جان........'' اور دوبارہ

حیدر کی طرف دیکھے بغیر وہ اپنے گھر کی طرف چل دی۔

آج ثباتی کی بارات آنے کو تھی۔ امریکہ سے۔ ابراہیم اپنے چار پانچ خاص الخاص رشتہ داروں کے ساتھ بارات لے کر آیا تھا۔ چائے ناشتے کے بعد نکاح کی رسم ادا کی گئی اور فوراً مہمانوں کے آگے کھانا چن دیا گیا۔ وہاں پر گاؤں کے پندرہ بیس افراد اور بھی موجود تھے، جو لڑکی والوں کی طرف سے مدعو تھے۔ ثباتی کی وداعی کے وقت سبھی کی آنکھیں نم تھیں۔ پہلے ثباتی اپنی والدہ سے لپٹ کر خوب روئی۔ جب مہمانوں میں سے کسی شخص نے وقت کا احساس دلایا تو اس کی ماں نے ثباتی کو دعائیں دیتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

''جاؤ بیٹی، تمھیں مولیٰ کی ضمانت میں دیا۔ جانے انجانے میں سرزد، گاؤں والوں سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگ کر ان کی دعائیں لے لو۔'' اس کے بعد ثباتی تمام بزرگوں سے ملی۔ گھر کے صدر دروازے کے قریب حیدر کو کھڑا دیکھ کر اس کے قدم زمین پر جم گیے اور وہ گھر کا دروازہ پکڑ کر پھوٹ پڑی تو حیدر نے دبی زبان سے صرف اتنا ہی کہا۔

''تمھیں روتا دیکھ کر میرا دل دکھتا ہے ثباتی، مت روؤ۔ خدا تمھیں خوش رکھے۔ جاؤ، خدا حافظ۔'' اور ثباتی سسکیوں کے ساتھ گھر سے باہر نکل کر پھولوں سے لدی ہوئی اس کار میں سوار ہوگئی جو فوراً ہوئی اڈے کی طرف جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

''شادی کے دوسرے ہفتے ثباتی کی والدہ نے حیدر کو بُلوا بھیجا۔ حیدر نے جیسے ہی ان کے گھر میں قدم رکھا، ثباتی کی ماں، اُسے دیکھ کر پھوٹ پڑیں تو حیدر کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ انھوں نے حیدر کو بٹھاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''کل دیر رات گیے، امریکہ سے ثباتی کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی.........!'' وہ بات پوری کیے بغیر پھر سسکنے لگیں۔

''وہ کیا کہہ رہی تھی، چچی جان؟ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تو ہے نہ؟'' حیدر بہت

مضطرب نظر آرہا تھا۔ تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد انھوں نے پھر کہا۔

''ہمارے ساتھ بہت بڑا دھوکہ ہوا ہے بیٹا۔ امریکہ کی چمک دمک اور .N.R.I کے نام پر ہم بری طرح سے ٹھگے گیے ہیں۔ ابراہیم شادی شدہ ہے بیٹا۔ اس کی پہلی بیوی، جو کہ ایک امریکن عورت ہے اور وہیں نوکری بھی کرتی ہے، وہ ابراہیم کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ ثباتی کے گھر میں قدم رکھتے ہی، ابراہیم اور اس امریکن عورت کے درمیان سخت ردو بدل ہوئی۔ باتوں کے درمیان ابراہیم نے اپنی امریکن بیوی سے جب یہ کہا کہ ثباتی ہماری بیوی نہیں ہے بلکہ میں ہندوستان سے تمھارے لیے ایک خادمہ لایا ہوں تو ثباتی کے پیروں تلے کی زمین ہی نکل گئی۔ اس پر تو مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے بیٹا۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ تم ہی کوئی صلاح دو...... مولیٰ اس پر رحم کرے۔'' اتنا کہہ کر وہ پھر سسکنے لگیں۔ حیدر جیسے سکتے میں آ گیا تھا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اس نے آہستہ سے کہا۔

''ان ناسازگار حالات کی وجہ سے میری تو عقل ہی خبط ہو کر رہی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ ثباتی کی مدد کس طرح کروں۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں سیدھے ثباتی سے باتیں کرنا چاہوں گا تاکہ اس کے تازہ حالات سے واقف ہو کر اُسے کچھ مثبت صلاح دے سکوں......'' اس نے کہا تو ثباتی کی ماں نے اس کی بات کاٹتے ہوے کہا۔

''نہیں نہیں بیٹا، اسے جلد بازی میں فون ہرگز نہ کرنا۔ اسی نے منع کیا تھا۔ جب ابراہیم اور اس کی امریکن بیوی گھر پر نہیں ہوں گے تب وہ خود ہی فون کرے گی۔ اس نے یہی کہا تھا''۔ یہ باتیں سن کر حیدر کو محسوس ہوا کہ ثباتی کا خیال ایک دم درست ہے۔ اسے خوشی تھی کہ ایسے ناسازگار حالات میں بھی اس کا فیصلہ ایک دم درست اور مناسب ہے۔ وہ دل ہی دل میں ثباتی کی سمجھداری کی داد دے رہا تھا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے چچی جان۔ جب دوبارہ ثباتی کا فون آئے تو اس سے کہیے گا کہ

میں نے حیدر کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔ یہ سننے کے بعد، جواب میں وہ جو کچھ کہے، مجھے بتایئے گا۔ اس کی سمجھداری سے مجھے پوری امید ہے کہ اس مسئلے کو وہ بخوبی حل کر لے گی۔ ثباتی کوئی عام لڑکی نہیں ہے چچی جان۔ میں اس کے ساتھ بچپن سے رہا ہوں۔ ایک سے بارویں درجہ تک ایک ساتھ تعلیم حاصل کی ہے۔ جہاں تک میں اُسے جانتا ہوں، اُسے کوئی بھی شخص آسانی سے شکست نہیں دے سکتا۔ وہ بہت باہوش اور زیرک لڑکی ہے۔ آپ میری باتوں پر یقین کیجیے۔ وہ بہت بہادر ہے، ابراہیم یا کوئی بھی شخص، اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ خاص کر ان حالات میں جبکہ ابراہیم نے اپنی امریکن بیوی کو بھی اپنے خلاف کر لیا ہے۔ اس کا فایدہ بھی ثباتی بڑی خوبصورتی سے اٹھائے گی۔ بس، اب جیسے ہی اس کا فون آئے، اس سے آئندہ کا وقت لے کر مجھے مطلع کر دیجیے گا۔'' حیدر کی باتیں، ثباتی کی والدہ کے لیے بہت اطمینان بخش تھیں۔ حیدر ان سے اجازت لے کر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

○

آج ثباتی اور ابراہیم کے درمیان سخت کلامی ہوئی تھی مگر بات زیادہ آگے نہ بڑھ سکی کیوں کہ ابراہیم کو اپنے دفتر کے کام سے آیندہ دس روز کے لیے شہر سے دور، نیویارک جانے کے لیے فوراً گھر سے نکلنا تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد ابراہیم کی امریکن بیوی نے ثباتی سے ہمدردی جتاتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔

''سباٹی، میں جانٹا ہاے کہ ٹوم اِنوسنٹ ہاے۔ اَبرہَم ٹو مارا ساٹ فراڈ کیا۔ ٹوم کو اوَر ٹو مارا گاریب مدر کو ہَرٹ کیا۔ Abraham is a monster، او آچا آڈمی نائی۔ ٹوم ابرہم کا ساٹ فائٹ کرے گا ٹو ہام ٹو مارا ساٹ ڈے گا۔ ہام سونا ٹھا کی آب اِنڈین اورٹ لوگ کھالی روٹا نائی، کھالی ہاٹ نائی جورٹا، اب او لوگ مرڈ کا کھلاپ فائٹ بھی کرتا۔ ویری گُڈ۔ ٹوم ابرہم کا لیگل وائف ہاے، اوس کا کِھلاپ فائٹ کرو۔ کورٹ

میں فائل سوٹ کارو۔ اِڈر کا کورٹ بہوٹ آچا ہاے۔ ٹو مارا ساٹ جسٹس کرے گا اَور کوئی N.G.O. بھی ٹو مارا ہلپ کرے گا۔'' جب اس نے ہر طرح سے ثباتی کی حوصلہ افزائی کی اور ہر قدم پر اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تو اس کی ہمت اور بڑھ گئی۔ اس نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

''Thank you sister ۔ میں جب تک زندہ ہوں، آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولونگی۔'' اتنا کہہ کر وہ سسکنے لگی۔

''ٹوم، ہام کو سِسٹر بولا۔ بہوٹ آچا لگا۔ ابر ہم ڈَس ڈین کا باد آئے گی۔ ہام، ٹو مارا کام کا کھاتر، آپنا آفس سے چوٹی لے گا۔ میرا ساٹ چالو۔ پہلا ٹو مارا 'گرین کارڈ' اپلائی کرو۔ اُس کا باڈ میں N.G.O. چالے گی اَور اپلیکیشن ڈے گی۔ پھر فیملی کورٹ چلے گی اَور ابر ہم کا کھیلاپ مو کا ڈما فائل کرے گی۔ ہام، ابر ہم کا کھیلاپ گاواہی بھی کرے گی۔ چالو، ٹیار ہو جاو۔'' اور ثباتی اس کے ساتھ باہر جانے کی تیاری کرنے لگی۔

○

شب کے تقریباً گیارہ بجے ہوں کہ ثباتی کی والدہ کے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی تو اس نے فون حیدر کی طرف بڑھا دیا مگر حیدر نے یہ کہتے ہوئے انھیں فون واپس کر دیا کہ پہلے وہ ثباتی کی خیریت دریافت کریں، اس کے بعد میں بات کروں گا۔

''ہلو.....سلام علیکم امی......آپ کیسی ہیں.....؟ جی ہاں۔ حیدر ہوں تو ان سے بات کرائیے۔'' اور انھوں نے فون حیدر کی طرف بڑھا دیا۔ جب ثباتی کی سُریلی آواز حیدر کے کان سے ٹکرائی تو وہ اتنا خوش ہوا کہ یہ بھی فراموش کر بیٹھا کہ ثباتی کی والدہ بھی اس کے قریب بیٹھی ہوئی ہوگی۔

''ہلو......حیدر......تم کیسے ہو؟'' اس رسمی جملے پر حیدر نے جواب دیا۔

''جب سے چچی جان کی زبانی، تمھارے متعلق اطلاع ملی ہے......میرے دن

کا چین اور راتوں کی نیند اڑ گئی ہے۔ دماغ ہر وقت تمھارے خیال میں گم رہتا ہے۔ بس اللہ تعالیٰ کو آلِ رسولؐ کی مصیبتوں کا واسطہ دے کر تمھارے لیے دعائیں کرتا رہتا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ تم کیسی ہو؟ ہم لوگوں سے کچھ نہ چھپانا۔ ہم لوگوں نے تمھاری شادی کی ہے، تمھیں فروخت نہیں کیا ہے......'' اس کی بات پوری ہونے سے قبل ہی ثباتی نے کہنا شروع کیا۔

''اب میں جو کچھ میں کہنے جا رہی ہوں، شاید اس پر تم لوگوں کو آسانی سے یقین نہ آئے مگر بات ایک دم سچ ہے...... چونکہ ابراہیم کی امریکن بیوی اس گھر میں میرا وجود پسند نہیں کرتی اس لیے وہ کھل کر میری مدد کر رہی ہے۔ مجھے گرین کارڈ مل چکا ہے اور اسی کی مدد سے ایک N.G.O. نے میرے مفت تعام کے ساتھ رہنے کا بھی معقول انتظام کروا دیا ہے۔ میں نے کورٹ میں ابراہیم کے خلاف مقدمہ بھی دائر کر دیا ہے۔ مقدمے کے تمام اخراجات کی ذمہ داری بھی ایک N.G.O. نے اٹھا رکھی ہے۔ فوری مدد کی صورت میں مجھے چار ہزار ڈالر ماہانہ کی ایک نوکری بھی مل گئی ہے، جو میرے اخراجات کے لیے کافی ہے۔ اس مقدمے کے سلسلے میں مجھے فوراً تمھاری مدد درکار ہے۔'' وہ ایک سانس میں اتنا کچھ بول گئی۔

''ہاں ہاں، کہو۔ میں تمھاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ تمھاری مدد کرنے میں اگر میری جان بھی چلی جائے تو مجھے خوشی ہوگی۔'' اس نے جذباتی ہو کر کہا۔

''او حیدر، میرے خیال سے امی تمھارے قریب ہی بیٹھی ہوں گی۔'' اور وہ ایک دم سے جھینپ گیا۔

''مطلب یہ ہے کہ ہم لوگ ہر نہج سے تمھاری مدد کرنے کو تیار ہیں۔ بولو، مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''میرے نکاح نامے کی ایک کاپی امی کے پاس ہے۔ جتنی جلدی ممکن ہو، اسے اسکین کروا کے مجھے میل کر دو۔ کورٹ میں اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ میں اپنا میل ابھی

S.M.S. کر دوں گی۔''

''ٹھیک ہے ثباتی، یہ کام میں فوراً کر دونگا۔ میں اب فون چچی جان کو دیتا ہوں۔ تم نے جو کچھ مجھے بتایا ہے، انھیں بھی بتا دو تا کہ وہ بھی مطمئن ہو جائیں۔'' اور اس نے فون ثباتی کی ماں کی طرف بڑھا دیا۔ ثباتی کی باتیں سن سن کر اس کی ماں کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی مگر ان کی آنکھیں مسلسل اشکبار تھی۔ شاید خوشی کے آنسو اسی کو کہتے ہیں۔ دونوں ماں بیٹی تو آپس میں گفتگو کر رہی تھیں مگر حیدر مسلسل اپنی آنکھیں زمین پر گڑائے اپنے ان الفاظ پر شرمندگی محسوس کر رہا تھا جو غیر ارادی طور پر ماں کی موجودگی میں اس کے منھ سے نکل گیے تھے۔

ثباتی کی طرف سے ابراہیم پر دائر مقدمے کا فیصلہ چند ماہ میں ہی ہو گیا تھا۔ اپنی ہمت اور حوصلے کے بدولت ثباتی یہ مقدمہ جیت گی تھی۔ اس نے فون کر کے تمام اطلاعات ماں کو دے دی تھی۔ آج کے فون پر اس کا آخری جملہ یہ تھا۔

''میں آیندہ جمعہ کو ہندوستان پہنچ رہی ہوں۔ آپ لوگوں سے ملنے کو دل بہت بے چین ہے امی۔'' اس کے ایک ایک لفظ سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

''اچھا...... یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے مگر یہ 'لوگوں' کون ہے جی۔ میرے سوا کن 'لوگوں' سے ملنے کو ترا دل بے چین ہے؟ وضاحت کرے گی۔'' انھوں نے چٹکی لیتے ہوے سوال کیا۔

مم..... مطلب، آپ سے، اور کس سے؟'' وہ ذرا گھبرائی گھبرائی سی لگ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے بیٹا۔ تو بس جلدی سے آ جا۔ مجھ سے بھی مل اور 'لوگوں' سے بھی۔ اب میں فون رکھتی ہوں تا کہ تیرے 'لوگوں' کو بھی تیرے آنے کی خوش خبروں دے دوں۔'' اور اس نے ''ہوں امی'' کہہ کر فون کاٹ دیا۔

مہلک مرض کی سند

جس طرح مستند شعرا کے اکثر مصرعے ضرب المثل بن جاتے ہیں اسی طرح وقت کے نشیب وفراز کے باعث ان میں سے کچھ باطل بھی ہو جاتے ہیں۔ کسی زمانے میں سنت کبیرؔ نے نوکری کو ''نِشِدھ'' فرماتے ہوئے بھیک کے مترادف قرار دیا تھا مگر ہر انسان کی زندگی میں نوکری کے معاون ہونے کے سبب یہ کہاوت ازخود باطل قرار پا گئی۔ آج حال یہ ہے کہ کسی بھی قیمت پر نوکری حاصل کر لینے کے سلسلے میں مفلس، ثروت مند، جاہل یا تعلیم یافتہ طبقے میں کوئی تخصیص نہیں۔ سرکاری نوکری حاصل کر لینے کی خواہش میں اکثر عوام اپنی تعلیم، رتبہ اور معیار تک کو فراموش کر جاتے ہیں۔ ان حضرات کا ہدف کسی بھی قیمت پر سرکاری نوکری حاصل کرنا ہوتا ہے۔

خداوند کریم کے عطیہ پر قانع اور صابر وشاکر ہونے کے عوض اکثر خود پر زیادہ بھروسہ کرنے والے افراد میں عبدالغفور بھی ایک تھا۔ اچھی سرکاری نوکری کے علاوہ اللہ تعلہ نے اُسے دو بیٹیوں اور ایک بیٹے جیسی نعمت بھی عطا کی تھی۔ خدا کے فضل وکرم سے اُس نے بڑی بیٹی کو اچھے گھر بیاہ دیا تھا جو فعال ہے مگر وہ بیٹے کی طرف سے قطعی مطمئن نہیں تھا اس لیے کہ بی۔اے۔ تک تعلیم حاصل کر چکنے کے بعد اس کی تقرری کہیں ممکن نہیں ہو سکی تھی۔ اُسے بس یہی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اس کی نوکری کے اب صرف دو برس باقی رہ گیے تھے چنانچہ اب وہ چھوٹی بیٹی کے عقد اور بیٹے کی نوکری کی فکر میں اپنی راتوں کی نینداور دن کا چین کھو بیٹھا تھا۔ بیٹی کی شادی کی طرف سے وہ زیادہ فکر مند نہیں تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد فنڈ اور گریچویٹی کے اتنے پیسے تو مل ہی جائیں گے جس سے وہ بیٹی کو بحسن وخوبی بیاہ

دے گا۔ اُسے اصل فکر تھی تو بیٹے کی نوکری کی۔ قاضی شہر کے اندیشے میں دُبلا اور عبدالغفور بیٹے کی نوکری کی فکر میں۔ اسی ذہنی چپقلش کے درمیان بلّی کے بھاگ سے چھیکا ٹوٹا۔ لوک سبھا کے عام انتخابات کے اعلان سے کچھ عرصہ قبل گورمنٹ کی جانب سے سرکاری اعلانیہ کے طور پر ایک سرکولر جاری کیا گیا جس کی رو سے اگر کوئی سرکاری ملازم مہلک بیماری کے سبب ریٹائرمنٹ سے قبل از خود ریٹائرمنٹ لے لے تو فوری مدد کے طور پر سرکار اس کے ایک بیٹے یا بیٹی کو تقرر کر لے گی۔ اس خبر سے سرکاری محکمے کے وہ افراد زیادہ خوش تھے، جن کے ریٹائرمنٹ قریب تھے۔ ان میں عبدالغفور بھی تھا۔ مگر اُسے اب بھی ایک فکر لاحق تھی کہ سرکاری قانون کے مطابق وہ مہلک مرض کہاں سے لائے جو اس کے ریٹائرمنٹ کے ساتھ اس کے بیٹے کی نوکری کی شکل میں اس کے خواب کی تعبیر ثابت ہو سکے۔ اب، جبکہ اُسے اپنے بیٹے عبدالحلیم کی نوکری کی امید کی کرن صاف نظر آ رہی تھی تو اُس نے اِس بات کا تذکرہ حلقۂ احباب میں بھی شروع کر دیا۔ بچپن کی دوستی کا فرض نبھانے اور اُسے اِس فکر سے نجات دلانے کی غرض سے ایک روز اس کے ایک مخلص دوست نے، جو کہ بڑے ہسپتال میں سرکاری ڈاکٹر تھا، ایک بڑی مثبت صلاح دے ڈالی۔

''اِس میں اِتنی فکر کی کیا بات ہے یار غفور؟ تمھارے ڈپارٹمنٹ کو مُہلک مرض کی سند ہی چاہیے نہ۔ بس تم ایسا کرو کہ کسی روز موقع تاڑ 'سِک' کر کے میرے ہسپتال میں بھرتی ہو جاؤ اور....... باقی سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو''۔ ڈاکٹر قدوس نے مسکراتے ہوئے اسے صلاح دی تو غفور نے خندہ پیشانی کے ساتھ دبی زبان میں کہا۔

''حقیقتاً میں بھی تم سے یہی چاہ رہا تھا یار قدوس مگر زبان کھولنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ اب جبکہ تم نے ہی ساری باتیں صاف کر دی ہیں تو......!''

''بس، جیسا کہا ہے ویسا ہی کرو۔ میں تمھارا منتظر رہوں گا''۔ اپنے ڈاکٹر دوست کی ایسی مثبت صلاح کے بعد وہ فوراً گھر کی طرف چل دیا۔ اب اُسے اپنی منزل

صاف نظر آ رہی تھی۔

اُس روز سے ٹھیک ایک ہفتہ کے بعد غفور نے اپنے دفتر میں پندرہ روز کے 'میڈیکل لیو' کی درخواست دے کر سرکاری ہسپتال میں بھرتی ہو گیا۔ جس روز وہ بھرتی ہوا تھا اُس روز اس کا دوست ڈاکٹر قدوس ڈیوٹی پر نہیں تھا۔ جب جونیر ڈاکٹر نے غفور سے اس کی تکلیف دریافت کی تو اس نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کہنا شروع کیا۔

''ڈاکٹر صاحب، اِدھر کئی دنوں سے نہ جانے کیوں میں بہت کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔ ذرا سا پیدل چلتا ہوں تو چکر آنے لگتا ہے۔ زینے چڑھنا تو ایک دم محال ہو گیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ مجھے ہو کیا گیا ہے؟'' یہ تمام کیفیات اُس نے ٹھہر ٹھہر کر مضمحل سی آواز میں ڈاکٹر سے بیان کی تو ڈاکٹر نے کسی بڑے اور مہلک مرض کے خدشے کے ساتھ اس کا بلڈ پریشر دیکھا۔ اس کے بعد متعدد جانچ اور دواؤں کی ایک لمبی سی فہرست پکڑانے سا تھا اُسے فوراً بھرتی بھی کر لیا۔ وہ دل ہی دل اپنی ایکٹنگ پر بہت خوش تھا کیونکہ یہ سب کچھ اس کی خواہش کے مطابق ہی تھا۔

دوسرے روز ڈاکٹر قدوس جب راؤنڈ پر آیا تو غفور کے بڈ کے پاس آ کر ٹھہر گیا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے اور ڈاکٹر نے رسماً اس کے دوا کے پرزے وغیرہ دیکھنے کے بعد اس سے آہستہ سے کہا۔

''اب تک سب کچھ پلان کے مطابق ہی ہوا ہے۔ جو دوائیں میرے جونیر نے منگوائی ہیں، ان میں سے ایک بھی مت کھانا بلکہ سب واپس کروا دو اور دواؤں کی رسید اپنے دفتر میں 'ری اِمبرس مِنٹ' کے غرض سے فوراً جمع کروا دو تا کہ سب کچھ یکے بعد دیگر مستحکم ترین ہوتا جائے۔ میں تمھارے لیے مہلک مرض کا سرٹی فیکیٹ تیار کروا دیتا ہوں، جو شام تک تمھیں مل جائے گا۔ اور تمھارے لیے ایک مہینے کی مزید چھٹی کی شفارس بھی لکھ دوں گا۔ چھٹی کی مدت گزرتے گزرتے تم اپنے دفتر میں نوکری سے ریٹائرمنٹ کی

درخواست بھی دے دینا۔ بس، اب میں چلتا ہوں''۔ اتنا کہہ کر ڈاکٹر قدوس آگے بڑھ گیا اور غفور کا بیٹا اس کے اشارے پر دوائیں واپس کرنے چل دیا۔

امید کے مطابق غفور کے دفتر نے اس کے مہلک مرض کے پیش نظر اس کے ریٹائرمنٹ کی درخواست فوراً منظور کر کے اسے نوکری سے ریٹائر کرنے کے بعد اس کی خواہش کے مطابق اس کے بیٹے حلیم کی نوکری کے لیے کاغذات ہڈ آفس کو بھیج دیے تھے۔ یہ تمام خبر غفور کے لیے نہایت دل خوش کن ثابت ہوئی تھیں۔

جب غفور کے گھر آ کر اس کے دفتر کے ایک چپراسی نے یہ خبر دی کہ کل بڑے صاحب اور ان کے ساتھ دفتر سے کئی اور لوگ اس کی مزاج پرسی کی غرض سے اس کے گھر تشریف لا رہے ہیں تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے حلیم کو ہدایت دی کہ کل میرے دفتر کے افسر اور دیگر ساتھیوں کے لیے بہترین ناشتے کا انتظام ضرور کرنا۔ اور وہ آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر بیٹے کے حسین مستقبل کے خواب سجانے لگا۔

دوسرے روز شام تقریباً چھ بجے دفتر کے چند کارکنوں کے ہمراہ جب چند افسران غفور کی مزاج پرسی کی غرض سے اس کے گھر پہنچے تو صدر دروازے پر بڑا سا قفل لٹکا دیکھ کر محلے والوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ آج دوپہر غفور کی حالت اچانک بگڑ گئی تھی جس کے سبب وہ لوگ غفور کو لے کر صدر ہسپتال گئے ہیں۔ یہ خبر سن کر ان لوگوں نے چند منٹوں تک آپس میں صلاح مشورہ کیا اور آفس کی جیپ صدر ہسپتال کی جانب مڑوا دی۔

صدر ہسپتال پہنچ کر بڑے صاحب نے جب .C.M.O سے ملاقات کی غرض سے اپنا شناختی کارڈ اس کے پاس بھجوایا تو اس نے انھیں فوراً اندر بلوا لیا۔ غفور کا حال دریافت کرنے پر .C.M.O نے انھیں بتایا کہ ''مسٹر عبدالغفور کی دونوں کڈنی پوری طرح سے ڈیمیج ہو چکی ہے۔ فی الحال ان کی ڈائلسس چل رہی ہے اس لیے وہ نیم بیہوشی کے عالم میں ہیں۔ آپ لوگ ایک ایک کر کے انھیں دیکھ سکتے ہیں''۔

بڑے صاحب نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ڈائلسس والے کمرے کی طرف چل دیے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے غفور کو یہ بتانا چاہا کہ اس کی خواہش کے مطابق گورمنٹ نے اِسی دفتر میں اس کے بیٹے عبدالحلیم کی تقرری منظور کر لی ہے مگر نیم بے ہوشی کے سبب غفور یہ خوش خبری سننے سے قاصر تھا۔

•

نئی صبح

صبیحہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اچھی اسکولی تعلیم اور بہتر گھریلو تربیت کے سبب گھر خاندان، محلے پڑوس اور سہیلیوں کے درمیان اسے ہر دل عزیز بنا دیا تھا۔ بے ایمانی اور حق تلفی اُسے کسی بھی نہج پر گوارہ نہ تھی۔ ہر کسی کی مشکلات میں وہ دل کھول کر اس کا ساتھ دیتی تھی۔ ہر کسی کے پھٹے میں ٹانگ ڈالنے سے پرہیز کی ہدایت کے برعکس اس کے والد اس کی حوصلہ افزائی دل کھول کر کرتے، جس کے سبب اس کی ہمت بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ اُس نے اپنے دائرۂ کار کو اپنی پڑھائی لکھائی اور گھریلو ذمہ داریوں کے دائرے سے کافی آگے بڑھا لیا تھا۔

''ابو جان، اگر بجلی کا بل آ گیا ہو تو مجھ پیسے اور بل دے دیجیے۔ کالج جاتے وقت جمع کر دوں گی کیوں کہ بجلی گھر کا دفتر تو مرے کالج کے راستے میں ہی ہے۔ آپ بلا وجہ کیوں پریشان ہوں؟'' اُس نے اپنے والد سے کہا تو وہ بولے۔

''ہاں، بل تو آ گیا ہے بیٹی مگر گزشتہ بلوں کی مانند اس بل پر بھی NR ہی لکھا ہوا ہے۔ یعنی یہ بل بھی ریڈنگ کے بغیر، اندازے سے ہی بھیجا گیا ہے۔ مجھے تو پتہ بھی نہیں کہ اصل بل کتنے روپے کا ہوگا۔ پتہ نہیں یہ بجلی والوں کا کیا گورکھ دھندا ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔'' اتنا کہتے ہوئے انھوں نے بجلی کا بل اور رقم صبیحہ کے حوالے کر دی۔

جب صبیحہ بجلی گھر کے دفتر پہنچی تو اُسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آج بجلی کا بل جمع کرنے والے کاؤنٹر پر بھیڑ بہت کم ہے۔ صرف تین چار افراد لائن میں کھڑے تھے۔ صبیحہ نے اپنے لڑکی ہونے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے سب سے آگے جا کر بل جمع

کر دینے کے بجائے لائن میں کھڑا ہونا پسند کیا جبکہ لائن میں کھڑے ایک شخص نے اس سے کہا بھی کہ وہ چاہے تو مہیلاؤں والی سہولت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سب سے آگے جا کر بل جمع کر دے مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ بمشکل تمام پندرہ منٹ کے بعد صبیحہ نے اپنے گھر کے بجلی کا بل جمع کر کے اس کام سے فراغت حاصل کر لی تھی۔ بل کاؤنٹر سے ہٹنے کے بعد جب وہ کالج جانے کے لیے پلٹی تو دیکھا کہ اسی دفتر کے ایک کمرے کے سامنے بہت سے آدمی اپنے ہاتھوں میں بجلی کے بل لیے ہوئے اپنی باری کے منتظر ہیں۔ اس نے جاننا چاہا کہ یہاں کیسی بھیڑ لگی ہوئی ہے جبکہ بل تو اس کھڑکی پر جمع ہو رہا ہے۔ دریافت کرنے پر اسے معلوم ہوا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے بل بہت زیادہ آگیے ہیں۔ یہاں بیٹھا ادھیکاری ان کے بلوں کو کم کرا دیتا ہے۔ کمرے میں بیٹھے ایک شخص سے ایک آدمی کہہ رہا تھا۔

''ارے صاحب، ہمارے گھر کے بجلی کا بل ڈیڑھ لاکھ روپے کیسے آ گیا۔ ہمارے گھر میں تو صرف تین پنکھے، دو کولر اور صرف آٹھ عدد بلب جلتے ہیں۔ ضرور آپ کی طرف سے کوئی غلطی ہوئی ہوگی۔ برائے مہربانی ہمارے بل کو چیک کروا لیجیے۔'' اس کی التجا پر ادھیکاری نے کہا۔

''غلطی ولتی کچھ نہیں ہوئی ہے، تمھارے گھر کے میٹر کی فائنل ریڈنگ کے مطابق ہی بل بنوا کر بھیجا گیا ہے۔ اگر تم نے ایک ہفتے کے اندر بل کا بُھگتان نہیں کیا تو تمھارے گھر کا کنکشن کاٹ دیا جائے گا'' اس نے نہایت بے رخی اور سختی کے ساتھ کہا۔

''نہیں صاحب، ایسا مت کیجیے گا۔ مہربانی ہوگی اگر ایک بار میرے گھر کے میٹر کی جانچ کروا لیجیے۔ اتنا زیادہ بل ہو ہی نہیں سکتا۔'' اس بڑے اعتماد سے کہا۔

''ٹھیک ہے، تم ایسا کرو کہ بڑے بابو سے مل لو۔ وہ شاید کوئی بہتر صلاح دے سکیں۔'' اور وہ شخص بڑے بابو کے کمرے کا محل وقوع دریافت کرنے کے بعد کمرے سے باہر نکل گیا۔ ان دونوں کی تمام گفتگو سننے کے بعد صبیحہ کی دلچسپی بڑھ گئی تھی اس لیے وہ بھی

اُس شخص کے پیچھے ہولی۔ اس راہ داری کے اخیر میں ہی بڑے بابو کا کمرہ تھا۔ میلے کف اور کالر کی بدرنگ سی قمیص اور پینٹ میں ملبوس، موٹے شیشے کی عینک لگائے، تقریباً پچپن برس کا ایک شخص ہی بڑا بابو تھا جسے اس سے ملنا تھا۔ صبیحہ ان کی باتیں سننے کی غرض سے اس انداز سے کمرے کے باہر ہی کھڑی ہوگئی جیسے اُسے بھی بڑے بابو سے کام ہو اور وہ اپنی باری کا انتظار کررہی ہو جبکہ وہ شخص کمرے کے اندر چلا گیا۔

''نمستے صاحب...... کسی غلطی کے سبب ہمارے گھر کے بجلی کا بل ڈیڑھ لاکھ روپے آگیا ہے۔ صاحب سے ملا تو انھوں نے آپ کے پاس صلاح کے لیے بھیجا ہے۔'' اتنا کہہ کر اس نے بل بڑے بابو کی طرف بڑھا دیا تو اس نے بل پر اُچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''دیکھو بھائی، گزشتہ کئی برسوں سے تم اپنے گھر کے بجلی کا بل NR پر جمع کر رہے ہو اور اب، جبکہ فائنل ریڈنگ کے بعد بل بھیجا گیا ہے تو وہ زیادہ تو ہوگا ہی..... اچھا ان باتوں کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ تمھارے اندازا کے مطابق یہ بل کتنے روپے تک کا ہونا چاہیے؟'' بڑے بابو نے اُسے غور سے دیکھتے ہوئے اپنائیت کے ساتھ سوال کیا۔

''میرے خیال سے ایک لاکھ روپے سے زیادہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ وہ بھی اس لیے کہ گزشتہ ڈیڑھ برسوں سے میں بل جمع ہی نہیں کیا تھا۔ ہاں صاحب، ایک لاکھ سے زیادہ قطعی نہیں ہونا چاہیے۔'' اس نے تخمینے کا اظہار کیا تو بڑے بابو نے اپنا چشمہ اتار کر میز پر رکھ دیا۔ بڑے بابو کچھ کہتا، اس سے قبل صبیحہ بھی کمرے میں داخل ہوگئی کیونکہ اس کے گھر کا بل بھی NR میں ہی آرہا تھا۔ بڑے بابو نے صبیحہ کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس شخص سے کہا۔

''میں تمھیں ایک صلاح دیتا ہوں، اگر پسند آجائے تو ٹھیک ورنہ جیسی تمھاری مرضی..... تم ایسا کرو کہ بڑے صاحب کے نام ایک اپلی کیشن لکھو کہ میرے گھر کے بجلی کے

بل کی ریڈنگ نہ ہونے کی وجہ سے بل غلط آیا ہے اس لیے اس میں دُرستی کرنے کی مہربانی کیجیے اور اس پر لگا ہوا بیاج بھی معاف کر دیجیے۔ اتنا لکھ کر اپلی کیشن مجھے دے دو۔ میں بڑے صاحب سے سفارش کر کے تمھارا بل صرف چالیس ہزار کروادوں گا اور تم وہ بل جمع کر کے آزاد ہو جانا...... بس اس خدمت کے عوض مزید پچیس ہزار روپے صاحب کو دینے کے لیے مجھے دے دینا یعنی اس طرح تمھارا کام ڈیڑھ لاکھ کے عوض صرف پینسٹھ ہزار میں ہو جائے گا اور تم فائدے میں رہو گے۔ اگر منظور ہو تو ٹھیک ورنہ جیسی تمھاری مرضی۔'' بڑے بابو نے اپنا فیصلہ سُنا دیا تو اُس نے تھوڑے عرصہ تک غور کرنے کے بعد سوال کیا۔

''ہاں، میں تیار ہوں مگر اس کی کیا گارنٹی ہے کہ آئندہ باقی پیسہ پھر کسی دوسرے بل میں نہیں جوڑ دیا جائے گا؟'' اس نے خدشہ ظاہر کیا تو بڑے بابو نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ صاحب کو اسی کام کے لیے تو پیسہ دیا جاتا ہے..... تم ایک دم بے فکر رہو۔'' اور وہ شخص پھر دوسرے روز پیسہ اور درخواست لے کر آنے کا وعدہ کرتے ہوئے بڑے بابو کو شکریہ کہا اور باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد بڑا بابو صبیحہ سے مخاطب ہوا تو اس نے اپنے گھر کے بجلی کا بل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

''ہمارے گھر کے بجلی کا بل بھی لگا تار NR ریڈنگ سے آرہا ہے اور ہم لوگ بل وقت پر جمع کر دیتے ہیں۔ کیا ہمارے گھر کے بجلی کا فائنل بل بھی بہت زیادہ آنے کی امید ہے۔''

''ہاں، ایک دم۔ یہ بل تو ایک اندازے کے مطابق بھیجا جاتا ہے..... اچھا یہ بتائیے کہ آپ کے گھر کا بجلی بل کب سے NR ریڈنگ کے ساتھ آرہا ہے؟'' اس نے سوال کیا تو صبیحہ نے کہا۔

''میرے اندازے کے مطابق تقریباً تین سال سے۔'' اُس نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

''تو سمجھ لیجیے کہ آپ کا بل بھی دو لاکھ روپے سے کم کا نہیں ہونا چاہیے۔ اگر آپ کہیے تو میں آپ کے گھر کا بھی فائنل بل بنوا دوں، اور بڑے صاحب سے شفارش کر کے اس میں سَن شودھن بھی کروا دوں گا۔'' بڑے بابو نے پیش کش کی۔

''یعنی اُسی شخص کی مانند، جو ابھی یہاں سے گیا ہے؟''

''جی ہاں۔ ایک دم اسی طرح۔ اس طرح آپ کا کام بھی بہت کم پیسوں میں بن جائے گا۔'' بڑے بابو نے خوش مزاجی کے ساتھ اپنے پن کا اظہار کیا۔

''مگر میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی۔ یہ اِس مسئلے کا مستقل حل نہیں ہے کیونکہ دو تین برس بعد پھر یہی ہوگا۔ جی نہیں، میں ایسا بالکل نہیں کروں گی۔'' جب اس نے سختی کے ساتھ انکار کر دیا تو بڑے بابو نے نہایت لاپرواہی سے کہا۔

''پھر جیسی آپ کی مرضی۔ اب آپ جا سکتی ہیں۔ میرے پاس فالتو باتوں کے لیے سمے نہیں ہے۔ ابھی اور بھی لوگ اپنی سمسیا لیے باہر کھڑے میرا انتظار کر رہے ہیں۔'' اس نے بے رخی سے کہا تو صبیحہ ایک دم سے بھنا گئی۔

''میں فالتو باتیں کر رہی ہوں..... جب کہ غلطی آپ کے ڈپارٹمنٹ کی ہے۔ آپ لوگ ہر ماہ صحیح صحیح بل کیوں نہیں بھیجتے......؟'' جب دونوں میں بحث ہونے لگی تو باہر کھڑے افراد میں سے بیشتر نے صبیحہ کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دیا۔ جب بڑے بابو کے ساتھ بحث مباحثے کی یہ خبر کسی نے بڑے صاحب کے گوش گذار کرائی تو اس نے صبیحہ کو ایک چپراسی سے اپنے دفتر میں بُلوا لیا۔ جب صبیحہ اس کے دفتر میں پہنچی تو دیکھا کہ یہ وہی شخص تھا جو ہر کسی فریادی کو بہتر صلاح کے لیے بڑے بابو کے پاس بھیج دیا کرتا تھا۔

بڑے صاحب نے صبیحہ سے سوال کیا۔

''کیا ہوا محترمہ؟ آپ ہمارے بڑے بابو پر اس قدر کیوں چلا رہی تھیں؟'' اس نے نرمی سے سوال کیا تو صبیحہ نے سارا ماجرہ دہرانے کے بعد اس افسر سے بھی یہی سوال کرلیا کہ بل جمع کرنے کی آخری تاریخ کے بعد کنکشن کاٹ کیوں نہیں دیا جاتا۔ آپ لوگ ایسا نہیں کرتے اسی لیے ہم لوگ بجلی کے بل کی طرف سے بے فکر ہو جاتے ہیں، جس کے نتیجہ میں یہ اس درجہ بڑھ جاتا ہے۔ اگر آپ ایسا کریں تو ہر ماہ آپ کے ڈپارٹمنٹ کو وقت پر ریونیو بھی مل جائے گا اور غریب پبلک پر یک بارگی اتنا بوجھ نہیں پڑے گا۔'' اس نے افسر کو سمجھانا چاہا تو اس نے اس کی بات بیچ میں ہی کاٹتے ہوئے کہا۔

''دیکھیے محترمہ، میں آپ سے بلاوجہ بحث نہیں کرنا چاہتا۔ ہمارے ڈپاٹمنٹ کے کچھ نظم وضبط ہیں۔ ہمارا ڈپارٹمنٹ آپ کی صلاح پر نہیں چلتا، سمجھیں۔ اب آپ جا سکتی ہیں۔'' وہ کچھ جھنجلایا ہوا سا لگ رہا تھا۔

''دیکھیے جناب، میں ایک پڑھی لکھی لڑکی ہوں۔ آریہ مہیلا کالج کی تھرڈ ایر کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ یہاں جو کچھ بھی چل رہا ہے، گزشتہ ایک گھنٹے میں مجھے اس کا اندازہ بخوبی ہو چکا ہے۔ آپ لوگ عوام کا استحصال کر رہے ہیں۔ ہر ماہ بل نہ آنا، بل آئے بھی تو NR ریڈنگ کے ساتھ اور ایک معینہ مدت کے بعد لاکھوں کا بل اور سنشودھن.....! اور بڑے بابو کی صلاح......میں یہ ہرگز نہیں ہونے دوں گی......!''

''دیکھیے محترمہ، آپ ہمارے ڈپارٹمنٹ پر بے بنیاد الزام لگا رہی ہیں۔ ہم پبلک کی جو مدد کر رہے ہیں اسے آپ استحصال کا نام دے رہی ہیں.....بہتر ہوگا کہ آپ اپنا کام کروائیے اور یہاں سے جائیے۔ ہمیں ابھی بہت سے لوگوں کی پریشانیوں پر غور کرتے ہوئے ان کی مدد کا نا ہے۔'' اُس نے مزید بدلے ہوئے تیور کا مظاہرہ کر کے صبیحہ پر رعب ڈالنے کی کوشش کی مگر صبیحہ بھلا کیوں کر اس کے رعب میں آتی۔ اس نے پھر کہا۔

''آپ جس طرح عوام کی مدد کر رہے ہیں، وہ مجھ پر پوری طرح سے واضح ہو

چکا ہے.....میں یہ ہرگز نہیں ہونے دونگی۔'' فی الحال تو میں جا رہی ہوں مگر جلد ہی واپس آکر آپ کی قلعی ضرور کھولونگی۔'' صبیحہ نے دھمکی بھرے انداز میں کہا تو افسر اندر ہی اندر تھوڑا خوف زرہ ضرور ہو گیا تھا مگر اُس نے اپنی خوفزدگی اُس پر ظاہر نہیں ہونے دی۔ اس نے نہایت اطمینان سے کہا۔

''جاؤ بیٹا، گھر جا کر گھریلوں کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹاؤ۔ کھانا بنانا سیکھو۔ تمھاری آئندہ کی گھریلوں زندگی میں یہی کام آئے گا، اس طرح کی نیتا گیری نہیں۔ لڑکی ہو تو لڑکیوں کی طرح رہنا سیکھو۔'' افسر نے مسکراتے ہوئے صبیحہ کا مذاق اُڑایا تو دفتر میں موجود اس کے تمام مصاحبوں نے قہقہا لگا کر افسر کی حوصلہ افزائی کی اور صبیحہ صرف اتنا کہتے ہوئے اس کے دفتر سے باہر نکل گئی کہ'' اب عورتیں اپنی ذمہ داریاں خوب سمجھنے لگی ہیں۔ اس لیے تمھارے مرد ہونے کے سبب ہم تم سے دبنے والے ہرگز نہیں۔'' صبیحہ کے پیچھے گھوم جانے کے بعد اس افسر نے دوبارہ اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

''ہٹ جاؤ بھائی، جھانسی کی رانی جا رہی ہیں۔ واپسی پر اپنی فوج لے کر ہم پر حملہ آور ہوں گی۔'' افسر کے اِس جملے پر اُس کے مصاحب خوب ہنسے تھے جبکہ وہاں جمع عوام کی سمجھ میں ساری حقیقت آ چکی تھی جس کے سبب وہ سب غصے میں تھے۔

گھر واپس لوٹ کر صبیحہ نے اپنے والد کو بجلی بل کی رسید دینے کے ساتھ بجلی دفتر والوں کی ساری دھاندلی اور افسر سے ہوئے اپنے بحث مباحثے کی ساری روداد سُنائی جسے وہ بڑے غور سے سُنتے رہے۔ تھوڑے عرصے تک خاموش رہنے کے بعد انھوں نے اس سے آہستہ سے پوچھا کہ اس سلسلے میں اب تمھارا کیا ارادہ ہے تو صبیحہ نے نہایت اعتماد کے ساتھ کہا۔

''اس افسر اور اس کے مصاحبوں نے جس طرح مجھے ایک کمزور لڑکی تصور کرتے ہوئے میرا مذاق اُڑایا ہے، وہ بےعزتی میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ خاص

طور پر سرکار کو دھوکہ دے کر یہ لوگ جس طرح بے ایمانیاں کر رہے ہیں اُسے یوں خاموشی کے ساتھ برداشت نہیں کیا جانا چاہیے۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں ان لوگوں کی بے ایمانی کے خلاف احتجاج کروں گی۔ مجھے قوی امید ہے کہ عوام میرا ساتھ دیں گے۔'' اس نے مستحکم ارادہ ظاہر کیا تو اس کے والد نے کہا۔

''کیا تمھیں یقین ہے کہ عوام تمھارے ساتھ دیں گے؟'' انھوں نے تشویش ظاہر کی۔

''بڑی بڑی مِلوں اور فیکٹریوں کے مالک نہ سہی، مگر عوام میں وہ لوگ تو میرا ساتھ ضرور دیں گے جو ان کی بے ایمانیوں اور چال بازیوں کا شکار ہورہے ہیں.....اور اگر کسی نے میرا ساتھ نہیں دیا تو بھی میں تنہا ان کی اس بے ایمانی اور دھوکہ بازی کی مخالفت ضرور کروں گی۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیشہ کی مانند حق اس معاملے میں بھی شرخ رو ہوگا اور اخیر میں جیت میری ہی ہوگی۔''

''میرے خیال سے اس قسم کی دھاندلی بہت بڑے پیانے پر ہورہی ہوگی۔ مجھے تو محسوس ہورہا ہے کہ سارا سسٹم ہی خراب ہوچکا ہے۔ تو ایک اکیلی لڑکی اتنے بڑے سسٹم کے خلاف کیسے لڑے گی؟ میرے خیال سے اس دھاندلی میں نیتا اور بڑے افسر تک ملے ہوں گے۔ میرے خیال سے.....'' جب وہ تھوڑے مایوس نظر آئے تو صبیحہ نے مضمحل سی آواز میں کہا۔

''ٹھیک ہے ابو جان، اگر آپ کی اجازت نہیں ہے تو میں خاموش بیٹھ جاتی ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ مایوس سی اپنے کمرے کی طرف جانے کے لیے مڑی تو اس کے والد نے اسے روک لیا۔

''تو مایوس نہ ہو میری بیٹی۔ حق وصداقت کا سبق میں نے ہی تجھے سکھایا ہے تو بھلا حق کی راہ کا حامی بننے پر میں تیری مخالفت کیسے کرسکتا ہوں.........! تو وہی کر جو تجھے

صحیح لگتا ہے۔ میں اور میری دعائیں تیرے ساتھ ہیں۔'' اپنے والد کے منہ سے ایسے حوصلہ افزا کلمات سن کر وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔ اب اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک اور خوداعتمادی صاف نظر آرہی تھی۔

بجلی والوں کی دھاندلی کے خلاف صبیحہ کو اَنشن پر بیٹھے ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ امید کے خلاف گزشتہ دو دنوں میں ہی اُسے سارا شہر اپنے ساتھ نظر آرہا تھا۔ شہر کے ہر اخبار کی سرخی میں اُسی کا نام تھا۔ ہر طرف اس کے اس قدم کی تعریفیں ہورہی تھیں۔ آج اچانک ڈی۔ایم۔صاحب، شہر کے ایم۔ایل۔اے۔ اور دیگر بڑے افسروں کے ہمراہ اس سے ملنے آئے تھے۔ ڈی۔ایم۔صاحب نے اس کے قریب آکر اس سے بڑی شفقت سے کہا۔

''صبیحہ بیٹی، میں نے اپنے ذرایعے سے اس سلسلے میں سب کچھ پتہ لگالیا ہے۔ اب مجھ پر تمام حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے۔ آپ برائے مہربانی اپنا اَنشن ختم کرنے کا اعلان کر دیجیے۔ میں آج شام چار بجے ایم۔ایل۔اے۔صاحب اور دیگر ذمہ دار افسران کے اہمراہ ایک نشست کے لیے آپ کو مدعو کرنے آیا ہوں، میرے دفتر پر۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس معاملے کی اِنکوائری میں پوری ایمانداری سے کرواؤں گا۔ اگر آپ کو مجھ پر یقین ہو تو......!''

اور اس نے مسکراتے ہوئے عوام سے ان الفاظ کے ساتھ اَنشن کے خاتمے کا اعلان کر دیا کہ کسی بھی سماج یا شعبے میں ہر کوئی بے ایمان نہیں ہوتا۔ آج بہت سے حق پرست اور ایماندار افسران ہر سماج میں موجود ہیں، جن پر پورے ملک اور قوم کو فخر ہے......عوام میں سے اگر کوئی معمولی آدمی بھی ڈرے بغیر، ہمت کے ساتھ حق تلفی کے خلاف آواز بلند کرے تو پورے عوام کے ساتھ خدا بھی اس کا ساتھ ضرور دے گا۔

●

پوت سپوت ہو کا دھن سنچے

سونیل مشرا اعلیٰ تعلیم یافتہ ایک اچھے خاندان کے چشم و چراغ تھے، جو اسی شہر میں اسسٹنٹ کمیشنر کے عہدے پر فائز تھے۔ ہر قسم کی کامیابی کو وہ محنت اور تعلیم کا سلہ مانںے کے ساتھ کسی حد تک قسمت کے بھی قایل تھے۔ ہر معقول شخص ان کی نگاہ میں لائق احترام تھا۔ بس انھیں اگر چڑھ تھی تو شاعری سے۔ اس کی بھی ایک خاص وجہ تھی۔ ان کے جد اعلیٰ جو کہ ایک بہت بڑے زمین دار تھے، وہ صاحب دیوان شاعر بھی تھے۔ ملک کے آزادی حاصل کرنے کے بعد ان کی زمینداری جاتی رہی تو یہ خاندان پڑھائی لکھائی کی طرف مائل ہو گیا اور اسی پڑھائی لکھائی کی بدولت عزت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ پھر بھی سونیل مشرا کا ماننا یہ تھا کہ ہمارے دادا حضور زمینداری کے خاتمے کے بعد یوں در بدر نہ ہوتے اگر وہ شاعر نہ ہوتے۔ گو کہ شاعری کی بدولت ہی ان کا سارا جاہ و جلال اور تمکنت خاک میں مل گیے۔ خود سونیل مشرا کی اردو تو اچھی تھی مگر وہ شعر و شاعری سے ہمیشہ کنارہ کش رہے۔ اپنے اکلوتے بیٹے انل مشرا کو اپنے خاندانی دستور کے مطابق انھوں نے اردو کی تعلیم تو دلوائی مگر شعر و شاعری سے ہمیشہ دور رکھا۔ اگر وہ کبھی کسی مشاعرے یا کوی سمیلن میں جانے کی کوشش کرتا تو اسے سختی سے منع کر دیتے۔ آج بھی ان کے بیٹے کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا جب اس نے ایک مشاعرے میں جانے کے لیے والد کی اجازت طلب کی۔

''بابو جی، ٹاؤن ہال میں آج ایک بہت بڑا کل ہند مشاعرہ ہونے والا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس میں چلا جاؤں؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے خواہش ظاہر کی تو وہ مشاعرے کا نام سنتے ہی وہ ایکدم سے بھڑک اٹھے۔

''میں نے تم کو کئی مرتبہ سمجھایا ہے کہ شعر و شاعری سے خود کو ایکدم دور رکھو۔ میری نگاہ میں شاعری شیطنت کے سوائے اور کچھ نہیں.......! شعر و شاعری دیوانے پن کی ایک علامت ہے بیٹا۔ خود کو اس سے زیادہ سے زیادہ دور رکھو۔ زندگی کی گاڑی صرف شاعری سے نہیں چلتی۔ یہ انسان کو کاہل، بے پروا اور ناکارہ بنا دیتی ہے، سمجھے۔ اگر اس کے چکر میں پھنسے تو پھر دنیا میں کچھ بھی نہ کر سکو گے۔'' ان کے تیور اچھے نہیں تھے پھر بھی انل نے ہمت بٹور کر کہا۔

''بقول آپ کے، اگر شاعری اتنی ہی بیکار شے ہے تو پھر آپ نے مجھ میں اردو کے لیے اتنا ذوق و شوق پیدا ہی کیوں کیا۔ کیا ضرورت تھی مجھے اردو پڑھانے کی؟ میری کامیاب زندگی کی ضمانت کے لیے آپ مجھے سائنس تو پڑھا ہی رہے تھے۔ مجھے اردو کی تعلیم دلانے کے لیے خاص طور سے ایک مولوی کیوں رکھا تھا؟''

''رونا آتا ہے تمھاری عقل پر انل میاں۔ اردو زبان صرف شاعری نہیں ہے۔ یہ ہماری تہذیب اور تمدم کا حصہ ہے۔ یہی ہماری خاندانی زبان ہے۔ اگر ہم نے اردو کو چھوڑ دیا تو سمجھو کہ اپنی تہذیب کے بڑے حصے سے نا آشنا ہو جائیں گے۔ میں تو اس حد تک اردو کا دلدادہ ہوں کہ انگریزی اور ہندی کے ساتھ اردو اخبار بھی ضرور منگواتا ہوں۔ مگر شاعری کو میں لغو تصور کرتا ہوں۔ اس لیے تم تو اس سے دور ہی رہنا۔'' وہ اپنے بیٹے کو کسی امام کی طرح درس دے رہے تھے۔ اس نے تھوڑے توقف کے بعد پھر کہا۔

''پتا جی، مجھے آپ سے معلوم ہوا ہے کہ ہمارے اجداد بڑے زمیندار تھے جو ایک کے دوسرے تک منتقل ہوتی رہی مگر چونکہ ہمارے پردادا شاعر تھے اس لیے انھوں نے شاعری کے چکر میں پھنس کر سب کچھ گنوا دیا۔ اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو بھی زمینداری تو ہمارے ہاتھوں سے جانی ہی تھی اس میں ان کی شاعری کا کیا قصور؟''

''اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو اپنی زمینیں بچانے کے لیے انھوں نے کھیتی باڑی میں

''میں نے تم کو کئی مرتبہ سمجھایا ہے کہ شعر و شاعری سے خود کو ایکدم دور رکھو۔ میری نگاہ میں شاعری شیطنت کے سوائے اور کچھ نہیں......! شعر و شاعری دیوانے پن کی ایک علامت ہے بیٹا۔ خود کو اس سے زیادہ سے زیادہ دور رکھو۔ زندگی کی گاڑی صرف شاعری سے نہیں چلتی۔ یہ انسان کو کاہل، بے پروا اور ناکارہ بنادیتی ہے، سمجھے۔ اگر اس کے چکر میں پھنسے تو پھر دنیا میں کچھ بھی نہ کر سکو گے۔'' ان کے تیور اچھے نہیں تھے پھر بھی انل نے ہمت بٹور کر کہا۔

''بقول آپ کے، اگر شاعری اتنی ہی بیکار شے ہے تو پھر آپ نے مجھ میں اردو کے لیے اتنا ذوق و شوق پیدا ہی کیوں کیا۔ کیا ضرورت تھی مجھے اردو پڑھانے کی؟ میری کامیاب زندگی کی ضمانت کے لیے آپ مجھے سائنس تو پڑھا ہی رہے تھے۔ مجھے اردو کی تعلیم دلانے کے لیے خاص طور سے ایک مولوی کیوں رکھا تھا؟''

''رونا آتا ہے تمھاری عقل پر انل میاں۔ اردو زبان صرف شاعری نہیں ہے۔ یہ ہماری تہذیب اور تمدم کا حصہ ہے۔ یہی ہماری خاندانی زبان ہے۔ اگر ہم نے اردو کو چھوڑ دیا تو سمجھو کہ اپنی تہذیب کے بڑے حصے سے ناآشنا ہو جائیں گے۔ میں تو اس حد تک اردو کا دلدادہ ہوں کہ انگریزی اور ہندی کے ساتھ اردو اخبار بھی ضرور منگواتا ہوں۔ مگر شاعری کو میں لغو تصور کرتا ہوں۔ اس لیے تم تو اس سے دور ہی رہنا۔'' وہ اپنے بیٹے کو کسی امام کی طرح درس دے رہے تھے۔ اس نے تھوڑے توقف کے بعد پھر کہا۔

''پتا جی، مجھے آپ سے معلوم ہوا ہے کہ ہمارے اجداد بڑے زمیندار تھے جو ایک کے دوسرے تک منتقل ہوتی رہی مگر چونکہ ہمارے پردادا شاعر تھے اس لیے انھوں نے شاعری کے چکر میں پھنس کر سب کچھ گنوادیا۔ اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو بھی زمینداری تو ہمارے ہاتھوں سے جانی ہی تھی اس میں ان کی شاعری کا کیا قصور؟''

''اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو اپنی زمینیں بچانے کے لیے انھوں نے کھیتی باڑی میں

دلچسپی دکھائی ہوتی، ہل اور بیل سے محبت کرتے۔ ایسی صورت میں ہم آج بھی سیکڑوں بیگھے کے کاشت کار ہوتے مگر ان کے شاعر ہونے کی وجہ سے سب کچھ ان کے ہاتھوں سے جاتا رہا۔ اب لے دے کے یہی قلم ہمارا سہارا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم شاعری کے چکر میں پھنس کر ناکارا ہو جاؤ۔"

"ہمارے خاندان کا تعلق بڑے زمینداروں سے تھا مگر آج اگر دنیا والے ہمارے اجداد میں سے کسی ایک کا بھی نام تک نہیں جانتے۔ اردو دنیا میں آج ہماری جو عزت ہے وہ صرف ہمارے پردادا کے اعلیٰ درجہ کے صاحب دیوان شاعر ہونے کی ہی وجہ ہے پتا جی۔ کیا آپ یہ تسلیم کرتے ہیں؟" انل کے اس سوال پر وہ ایکدم لاجواب ہو گیے مگر پھر بھی اپنے اسی قول پر اڑے رہے کہ شاعری دوانے پن کی علامت ہے اس لیے تم شاعری سے قطعی دور ہی رہنا۔ مگر انل کے اصرار پر انھوں نے اسے مشاعروں میں جانے کی اجازت دے دی تھی۔

انل شاعری تو کرتا تھا مگر چونکہ اس کے والد کو یہ ناپسند تھی اس لیے اس نے اپنا تخلص شارؔب اپنا لیا تھا تا کہ کوئی بھی یہ نہ جان سکے کہ انل ہی شارب ہے۔ جہاں کہیں وہ اپنا کلام بھیجتا اس کے ساتھ اپنے گھر کا پتہ دینے کے بجائے دوست کے گھر کا پتہ دیتا، اس طرح اس کے حصے کے سارے اردو رسائل، جرائد اور اس کے نام کے خطوط تک دوست کے پتہ پر ہی آتے تھے۔

انل کی اعلیٰ شاعری کی دھوم اب تمام ملک میں تھی۔ مہینے میں ایک دو مرتبہ تو اسے مشاعرہ پڑھنے کے لیے شہر سے باہر جانا ہی پڑتا تھا۔ اس درمیان اس کے کئی معیاری مجموعے بھی منظر عام پر آچکے تھے۔ وہ یہ سب کچھ کرتا مگر والد کو اس بھنک نہ لگنے دیتا۔ چونکہ کالج کی پڑھائی میں بھی وہ ہمیشہ امتیازی نمبروں سے پاس ہوتا تھا اس لیے والد اس کی طرف سے ایک دم بے فکر تھے۔ انھیں یقین کامل تھا کہ ہمارا بیٹا ایک دن بڑا

افسر ضرور بنے گا۔ ایک روز اس نے اپنے والد سے کہا۔

''بابو جی، کل مجھے ذرا ایک ضروری کام سے دہلی جانا ہے۔ دو روز بعد واپس آجاؤنگا۔'' اس نے والد سے اجازت چاہی انھوں نے کچھ روپے دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ضرور جاؤ مگر ذرا ہوشیار رہنا کیوں کہ تم ٹھہرے بھولے بھالے، تمھیں کوئی بھی آسانی سے دھوکہ دے سکتا ہے۔'' انھوں نے ہدایت دی۔

''ارے بابو جی اب میں ایکدم سے بچہ نہیں رہا۔ گریجویٹ ہو چکا ہوں۔ آپ ایک دم فکر نہ کریں۔ میں دو روز بعد آجاؤنگا۔'' اور وہ مطمئن ہوگیے۔

انل نے دہلی پہنچے کے بعد والدہ کو اپنی خیریت کا فون کر دیا تھا تا کہ دونوں لوگ مطمئن ہو جائیں۔

دوسری صبح انل کی والدہ نے حسب دستور چاے کے ساتھ تینوں اخبار شوہر کے آگے رکھ دیے۔ انھوں نے سب سے پہلے ہندی کا اخبار اٹھایا۔ اس میں دوسری بڑی سرخیوں کے ہمراہ یہ خبر بھی تھی کہ 'دیش کے یوا شاعر کو گالب پرسکار'۔ یہی خبر انگریزی اخبار میں بھی تھی مگر اس اخبار میں اس خبر کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ جب اخیر میں انھوں نے اردو اخبار اٹھایا تو اس کی سرخی کچھ اس طرح سے تھی ''ملک کے نوجوان شاعر شارب کو اس سال کے غالب انعام سے نوازا لیا''۔ اس خبر کے ساتھ انل کی ایک خوبصورت سی تصویر شایع کی گئی تھی، جس میں وہ وزیر اعلیٰ سے غالب انعام وصول کر رہا تھا۔ سونیل ہر زاویہ سے بار بار وہ تصویر بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ چند منٹوں کے بعد انھوں نے وہ اخبار بیوی کی طرف بڑھا دیا تو اخبار پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد شوہر سے کہا۔

''مجھے اخبار پڑھنے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ کیا کوئی خاص خبر شایع ہوئی ہے جو آپ نے اخبار پڑھے بغیر میری طرف بڑھا دیا؟''

''تم نے غور نہیں کیا؟ یہ انل کی ہی تصویر ہے نہ۔ انل ہی شارب کے نام سے شاعری کرتا ہے اور آج اسے اتنا بڑا انعام ملا ہے۔ اس خبر نے تو مجھے حیرت میں ڈال دیا ہے۔ انل......شارب......!'' ان کا منھ کھلا رہ گیا تھا۔

''یہ خبر پڑھ کر مجھے صرف خوشی ہوئی تھی، حیرت ایکدم نہیں۔ اسے تو بڑے انعام واکرام سے نوازا ہی جانا تھا.........! انل پندرہ برس کی عمر سے شاعری کرر ہا ہے۔ میں نے اسے شاعری سے کبھی نہیں روکا بلکہ ہمیشہ اس کی حوصلہ افزائی کی۔ یہ ہنر تو بھگوان کی دین ہے وہ جسے چاہے نوازتا ہے۔ شاعری نہ تو کالج اور یونیورسٹی میں سکھائی جاتی ہے نہ ہی کسی ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں۔ انسان میں یہ صلاحیت خداداد ہوتی ہے۔'' اتنا کہنے کے بعد انھوں نے مسکراتے ہوے سوال کیا کہ اب ان کا کیا خیال ہے؟

''آج زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے میں غلطی پر تھا۔ میں دل ہی دل انل سے شرمندہ بھی ہوں۔ شاعری تو واقعی قدرت کا عطیہ ہے۔ انسان اپنی کوششوں سے چاند اور مریخ تک پہنچ سکتا ہے، بے شمار دولت، نام ونمود کا مالک بن سکتا ہے۔ یہی نہیں وہ اپنی کوششوں سے پردھان منتری تک بن سکتا ہے مگر شاعر نہیں بن سکتا۔'' سونیل کے چہرے پر آج جو خوشی تھی ویسی خوشی اس کے چہرے پر اس وقت بھی نہیں تھی جب اس نے انل کی ولادت کی خبر سنی تھی۔

محدود دائرہ

خاندانی روایت کے مطابق طارق کی شادی اُس کی خالا کی لڑکی سے کر دی گئی۔ آپس میں ہوئی شادیوں میں چونکہ عام طور پر شکل وصورت، پڑھائی لکھائی، عمر اور روپے پیسے کو فوقیت نہیں دی جاتی اس لیے جب یہ شادی ہوئی، اُس وقت طارق بی.اے. کا طالب علم تھا۔ دونوں بہنوں نے آپس میں سمجھوتا کر لیا تھا کہ جب تک طارق برسرِ روزگار نہیں ہو جاتا، اُس وقت تک طارق کی بیوی مائکے میں ہی رہے گی اور اُس کے تمام ذاتی اخراجات کی ذمہ داری طارق کے بجائے شکیلا کے والدین کی ہوگی۔ ہر چند کہ شکیلا کا مستقل قیام مائکے میں ہی تھا مگر وقتاً فوقتاً وہ اپنی سُسرال بھی آیا جایا کرتی تھی۔ عام طور پر اُس دوران جب طارق کے کالج میں چھٹیاں ہوتی تھیں۔ چھٹیوں کے دوران کبھی کبھار طارق بھی اپنی خالا کے گھر چلا جایا کرتا تھا۔ لیکن شکیلا کا مستقل قیام مائکے میں ہی تھا۔

شکیلا کی صلاح پر طارق نے دوستی یاری اور سیر وتفریح کو ایک دم ترک کر دیا تھا اور پوری تندہی سے نوکری تلاش کرنے کی غرض سے کمپٹیشن کی تیاری میں لگ گیا تھا۔ وہ ذہین اور محنتی تو تھا ہی چنانچہ دو تین کوششوں کے بعد ہی اُس کی تقرری سپلائی آفس میں اِنسپکٹر کے عہدے پر ہوگئی۔ بیوی کی اس صلاح کے بعد ملی اتنی بڑی کامیابی نے اُسے شکیلا کا مُرید بنا دیا تھا۔ طارق کو نوکری مل جانے کے بعد شکیلا مستقل طور پر سسرال میں رہنے لگی تھی اور اُس نے اپنے دونوں بچوں کا داخلہ بھی شہر کے نامی گرامی اسکول میں کروا دیا تھا۔ طارق کی اچھی تنخواہ اور 'اوپری آمدنی' کی وجہ سے گھر میں پیسوں کی ریل پیل

تھی۔ شاید اسی سبب طارق کے ذہن میں مادیت نے گھر بنانا شروع کر دیا تھا۔

شکیلا چونکہ سیر و تفریح کی شوقین تھی اس لیے وہ اکثر کبھی دہلی تو کبھی گوا یا ممبئی گھومنے کی تجویز طارق کے سامنے رکھتی مگر وہ کسی نہ کسی بہانے سے ٹال جایا کرتا تھا۔ دو بچوں کے ہمراہ کہیں دور دراز گھومنے جانے کا مطلب تھا کم از کم پچیس تیس ہزار روپیوں کا خرچ اور اس درمیان دفتر سے چھٹی کے سبب کئی ہزار کا انقصان الگ۔ دل میں یہی خیال لیے طارق اُس کے پروگرام کو خوبصورتی کے ساتھ ٹال جایا کرتا تھا۔

''ممبئی دیکھنے کی خواہش تو میری بھی ہے مگر ابھی نہیں۔ دسمبر میں بچوں کی بڑے دن کی چھٹیوں میں چلیں تو بہتر ہوگا۔ اِس طرح اُن کی پڑھائی لکھائی کا بھی نقصان نہیں ہوگا اور میں اپنے دفتر سے .L.T.C بھی لے لونگا۔'' طارق کی یہ تجویز شکیلا کو پسند آئی اور یہ پروگرام دسمبر تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔

طے شدہ صراحت کے مطابق شکیلا نے سفر کی تیاریاں نومبر کے مہینے سے ہی شروع کر دی تھیں۔ جب شکیلا نے اُسے سفر کی تیاری کے متعلق بتایا تو اُس نے خوشی کا اظہار کرنے کے بجائے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ سب تو ٹھیک ہے شکیلا مگر گھومنے پھرنے کا مزہ جب ہے کہ بچوں کی صحت اچھی رہے۔ مُنی، ابھی ابھی تو ٹائی فائڈ سے اُٹھی ہے۔ کتنی کمزور ہوگئی ہے بیچاری۔ میرا خیال ہے کہ اُس کے پوری طرح سے صحتیاب ہو جانے تک ہمیں ارادہ ملتوی کر دینا ہی بہتر ہے۔'' طارق نے تشویش کن لہجے میں کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر میں نے سارے انتظامات مکمل کر لیے تھے اور اگر تم اسی سال دسمبر تک نہیں گیے تو LTC کے اس بلاک کا فائدہ اٹھانے سے محروم رہ جاؤ گے۔''

''تو کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر یہ LTC لیپس ہوگئی تو اگلی ڈیو ہو جاے گی۔ آئندہ برس ہم لوگ ان شاءاللہ ممبئی کے ساتھ گوا بھی جائیں گے۔ پھر کون کہے کہ ہمارے پاس

وقت کی کمی ہے۔ابھی تو سیر وتفریح کے لیے عمر پڑی ہے۔'' طارق کے اس رٹے رٹائے جملے نے اُسے ایک مرتبہ پھر سے ہموار کرلیا اور یہ پروگرام آئندہ گرمیوں کی چھٹی تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔اس بار ممبئی یا گوا کے بجائے بات کشمیر کی سیر پر ختم ہوئی تھی۔

''تمھارا خیال ایک دم درست ہے طارق۔دہلی، ممبئی اور گوا تو اپنے شہر اور گھر آنگن جیسا ہے۔ جب دل چاہا گھوم لیں گے۔ہاں کشمیر جانا کارے دارد جیسا مسئلہ ہے۔دیس بدیس کے لوگ دور دراز ملکوں سے بھارت آکر کشمیر دیکھ جاتے ہیں۔ہم ہندوستانی، کشمیر ہمارا ہے اور ہم ہی اسے نہیں دیکھ پاتے۔کبھی دور دراز کا پہاڑی علاقہ ہونے کے سبب زیادہ اخراجات کے خیال کے سے تو کبھی وہاں پر پھیلے آتنک واد کی وجہ سے ہم لوگ ادھر کا رخ کرنے میں ہچکچاتے ہیں۔خدا کا شکر ہے کہ اب وہاں پوری طرح سے امن قایم ہو چکا ہے اس لیے اب کہ گرمیوں میں کشمیر کو ٹور طے ہے۔'' طارق کے اس خیال پر بچے بھی خوش ہو گیے تھے۔

طارق کی تفریح کا پروگرام نہ ہوا، غازی میاں کا بیاہ ہو گیا، گرمی کی چھٹی سے ٹلتا تو بڑے دن کی چھٹی اور بڑے دن کی چھٹی سے ٹلتا تو گرمی کی چھٹی۔

گزشتہ گرمی کی چھٹیوں میں ان دونوں کا بچوں کے ساتھ کشمیر جانا طے تھا۔ٹکٹ تک ریزرو کروا لیے گیے تھے مگر مئی کے مہینے میں قریبی رشتہ داری میں یکے بعد دیگرے پڑنے والی دو شادیوں کی وجہ سے یہ پروگرام بھی انھیں آئندہ جاڑے تک کے لیے ٹالنا پڑ گیا۔اس پروگرام کے ٹلنے پر جب شکیلا نے افسوس کا اظہار کیا تو طارق نے اُسے دلاسا دیتے ہوے کہا۔

''اِس میں اتنا بدظن ہونے کی کیا بات ہے؟ گھومنے ٹہلنے کے لیے تو تمام عمر پڑی ہے۔صرف سیر وتفریح کے لیے گھر کی شادیوں میں شریک نہ ہوے تو ہمیشہ کے لیے شکوہ شکایت رہ جاے گا۔'' اور شکیلا کو محسوس ہوا کہ شاید طارق ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔

گزشتہ پندرہ برسوں کی نوکری میں طارق نے کافی دولت جمع کر لی تھی چنانچہ اب وہ لوگ اپنا پشتینی گھر چھوڑ کر ایک فلیٹ میں منتقل ہو گیے تھے۔ کرائے پر نہیں بلکہ اس نے پانچ کمروں پر مشتمل ایک خوبصورت فلیٹ خرید لیا تھا۔ آبائی مکان سے فلیٹ میں منتقل ہو کر بچے بھی بہت خوش تھے۔ اس بار بڑے دن کی چھٹی میں ان لوگوں کا ممبئی اور گوا کا پروگرام طے تو تھا مگر مارچ میں ہونے والے بیٹی کے امتحان اور مئی میں بیٹے کے کمپٹیشن والے امتحانات کے سبب بننے سے قبل ہی اس پروگرام کو رد کر دیا گیا۔ طارق کا خیال تھا کہ ہمیں اپنے بچوں کے مستقبل کے پیش نظر فی الحال یہ پروگرام آئندہ کے لیے ٹال دینا چاہئے کیوں کہ پندرہ بیس دنوں کی گھمائی پھرائی کی وجہ سے بچوں کا دل پڑائی کی طرف سے ہٹ جائے گا، جو ٹھیک نہیں۔ ہمارے لیے بچوں کا مستقبل ہی سب کچھ ہے۔ پھر سیر تفریح کے لیے تو ساری عمر پڑی ہے۔ اور شکیلا نے ایک پھر دل ہی دل طارق کی سمجھداری کی داد دی۔

والدین کی توجہ اور بچوں کی محنت کے سبب طارق کا بیٹا 'ناسا' میں سائنٹسٹ اور بیٹی کی تقرری ایمس میں بحیثیت ڈاکٹر ہو گئی تھی۔ اس درمیان شکیلا شوگر کی مریضہ ہو گئی تھی جس کے سبب اب وہ اپنی مرضی کا کھانا کھانے تک سے محروم ہو گئی تھی۔ اب ان لوگوں نے کہیں بھی گھومنے پھرنے کا ارادہ قطعی ترک کر دیا تھا۔ ایک روز شکیلا نے طارق سے حج بیت اللہ اور زیارت مقامات مقدسہ کی خواہش ظاہر کی تو طارق نے چہک کر کہا۔

''بخدا، تم نے تو میرے منہ کی بات چھین لی۔ حقیقتاً میں بھی یہی چاہتا ہوں مگر کیا کروں، تمہاری بیماری شاید ہماری اس صراحت میں بھی مانع ہو۔ مگر میں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے مایوس نہیں ہوں۔ خدا نے چاہا تو تم جلد ٹھیک ہو جاؤ گی اور ہم لوگ حج کے لیے ضرور جائیں گے۔ ابھی تو تمام عمر پڑی ہے۔''

وسیم حیدر ہاشمی

کی

دیگر مطبوعات

- جھینی جھینی بنی چدریا (ہندی ناول کا اردو ترجمہ ۱۹۹۷ء)
- کرچیاں (افسانوی مجموعہ ۲۰۰۷ء)
- مریخ کا سفر (افسانوی مجموعہ ۲۰۱۰ء)
- رثائی ادب کے چند پہلو (تحقیقی وتنقیدی مضامین ۲۰۱۳ء)
- مضامینِ ہاشمی (تحقیقی وتنقیدی مضامین ۲۰۱۴ء)
- گوہرِ پس انداز (افسانوی مجموعہ 2015)

زیر طبع

- ناقدینِ انیس: از مولانا محمد حسین آزاد تا حال
- تلاشِ نقشِ کفِ پا (ناولٹ)
- عاصی جونپوری: حیات اور شاعری
- ہوش جونپوری: حیات اور ادبی خدمات
- مشاہیر کے کلام میں ذکرِ بے ثباتی
- احساسِ کرب (شعری مجموعہ)
- تجلیاتِ انیس [انیس پر لکھی گئی کتابوں کا جائزہ] جلد اول. جلد دوم. جلد سوم
- مہدی اعظمی: حیات، شخصیت اور شاعری

تزئین وطباعت
پرنٹیا پبلی کیشن وارانسی
9125797969
کے اہتمام سے

Scanned with CamScanner

انسانی محبت کے نظریہ سے بے لوث اور گہری وابستگی رکھنے والے وسیم حیدر ہاشمی معاشرتی ناہمواریوں کی نشاندہی بھی اس سلیقے سے کرتے ہیں کہ موقف کی رسائی بھی ہوجائے اور کسی کا دل بھی زخمی نہ ہو۔ ثقافتی عناصر کے ساتھ اخلاقی انحطاط اور معاشی حقوق جیسے دوسرے پہلو بھی ان کے افسانوں میں نظر آتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ حقیقت نگار وسیم حیدر ہاشمی کی افسانوی کائنات موضوعاتی تنوع کے حساب سے محدود ہے۔ جب کہ یہ کہنا حق بجانب ہے کہ اس پر آشوب موسم اور خوفناک عہد میں وہ انسان دوستی اور محبت پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور محبت کی یہ وسیع کائنات ان کے تجربے، مشاہدہ، تخیل اور اسلوب کا حصہ ہے۔ غور کریں تو ہم ایک ایسے سائنسی عہد کے کمزور کردار یا کٹھ پتلیاں ہیں، جہاں امن سکون غارت، خوف میں ڈوبا ہوا اور فرقہ واریت کی تیز آندھیوں میں جھلستا ہوا معاشرہ ہے۔ مثبت تبدیلیوں کی امید میں منظم، موثر ہر کوشش رائگاں اور غور کریں تو انسانی تحفظات کی بقا کے لیے اس خوفناک موسم میں ایک ادیب کی ذمہ داریاں پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ فکشن جس وژن اور سنجیدگی کا متقاضی ہے، وسیم حیدر ہاشمی نے پورے خلوص کے ساتھ اور گہرائی سے اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ الفاظ کے خوبصورت استعمال اور ساحرانہ عمل یا چابک دستی سے انہوں نے ہر افسانے کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں اس افسانوی انتخاب پر انہیں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

مشرف عالم ذوقی